علم معاشیات
اور
اسلامی معاشیات
ڈاکٹر اوصاف احمد
IFA PUBLICATIONS
ایفا پبلیکیشنز

سلسلہ محاضراتِ مدارس

علم معاشیات اور اسلامی معاشیات

ڈاکٹر اوصاف احمد

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾

[سورہ نساء:۲۹]

[اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ، ہاں البتہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو]

فہرست

پیش لفظ

کسی بھی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی افرادی قوت ہے اور افرادی قوت صرف تعداد اور مقدار کا نام نہیں ہے بلکہ یہ افراد کی استعداد اور ان کے معیار سے عبارت ہے، جس قوم میں باصلاحیت افراد نہ ہوں وہ صالح اور دانش مند قیادت سے محروم ہو جاتی ہے اور پھر بے سمتی، منزل سے محرومی اور زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سب سے زیادہ توجہ شخصیت اور کردار سازی پر دی اور صحابہ کرام کی فکری، علمی اور عملی تربیت فرمائی، چنانچہ قرآن مجید نے امت سے آپ کے ربط و تعلق کو زیادہ تر جس نسبت سے نمایاں کیا ہے، وہ تعلیم وتزکیہ ہے، "يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"۔

علماء چونکہ اس امت کے فکری اور دینی رہنما ہیں اور ان کی حیثیت صراط مستقیم کے لئے قبلہ نما کی سی ہے، اس لئے ان کی فکری تعمیر نہایت اہم کام ہے، موجودہ حالات میں جیسے جیسے دنیا سمٹتی جارہی ہے اور فاصلے کم ہوتے جارہے ہیں، علماء کی ذمہ داریاں بڑھتی جارہی ہیں اور یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی لحاظ سے تیار کریں، ماضی قریب کے اہل علم حضرات میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو اس کی خاص فکر تھی، چنانچہ جب انہوں نے اسلامک فقہ اکیڈمی قائم فرمائی تو اس کے مقاصد میں دو باتوں کو خصوصی اہمیت دی گئی، ایک عصر حاضر میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کا حل جس کے لئے خاص طور پر فقہی سمیناروں کا سلسلہ شروع کیا گیا، دوسرے نوجوان فضلاء کی تربیت۔ بانی اکیڈمی کی نظر میں اس کام کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں تھی، چنانچہ تیسرے فقہی سمینار جو بنگلور میں ۱۹۹۰ء میں منعقد ہوا باضابطہ تجویز منظور کی گئی کہ دینی

مدارس میں محاضرات رکھے جائیں اور علمی وتحقیقی کاموں کے لئے فضا بنائی جائے۔

چنانچہ اکیڈمی نے حسب موقع وسہولت دینی مدارس میں محاضرات اور علمی مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا، جو اب تک جاری ہے، ان محاضرات ومذاکرات (ورکشاپ) کے ذریعہ ایک طرف طلبہ کو اسلام کے اصول قانون، احکام شریعت کے بنیادی مقاصد اور نئے مسائل کے حل کے سلسلہ میں اصول وقواعد سے روشناس کیا گیا اور دوسری طرف معاشیات، سماجیات، سیاسیات اور عالمی حالات وتحریکات سے متعلق مفید، ضروری اور جدید معلومات فراہم کی گئیں، تاکہ وہ اپنے عہد کے تقاضوں، ضرورتوں اور ان کے فکری پس منظر کو سمجھ سکیں اور شریعت کے اصول ومقاصد کی روشنی میں انہیں حل کرسکیں، اس مقصد کے تحت دینی مدارس کی منتہی جماعتوں کے طلبہ کے لئے کئی تربیتی کیمپ رکھے گئے، جن میں عصری علوم کے ماہرین نے خطبات دیئے، متعدد ورکشاپ رکھے گئے جن میں عالم عرب کے بعض معروف علماء واساتذہ نے شرکت فرمائی اور وقف کے موضوع پر ایک بین المدارس مذاکرہ بھی رکھا گیا۔

موجودہ دور میں یوں تو ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلیاں آئی ہیں، لیکن خاص کر نظام معیشت میں دوررس تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، نئے مالیاتی ادارے وجود میں آئے ہیں، گلوبلائزیشن کے عمل نے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے، پوری دنیا معاشی اعتبار سے باہم مربوط ہوگئی ہے، اور معاشیات کے میدان میں بہت سے نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، جن کے بارے میں علماء پر دو طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ ان نئے مسائل کا شرعی حل پیش کریں، دوسرے موجودہ معاشی نظام میں جو ادارے ضرورت کا درجہ اختیار کر گئے ہیں، لیکن جن کی تشکیل اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہوئی ہے، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا متبادل پیش کریں؛ کیونکہ اس کے بغیر ہم قانون شریعت کی ابدیت اور اس میں رواں دواں زندگی کی ضرورتوں کو پوری کرنے کی صلاحیت کو ثابت نہیں کرسکتے۔

محترم جناب ڈاکٹر اوصاف احمد اس وقت ہندوستان کے ان چند اصحاب دانش میں سے ہیں، جو موجودہ عالمی نظام معیشت پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، اور اقتصادیات کے بارے میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے بھی آگاہ ہیں، نیز اسلامک بنک کاری اور جدید مالیاتی نظام پر ان کی تحریریں ملک کے مؤقر جرائد ورسائل میں طبع ہوتی رہی ہیں۔ اکیڈمی نے ڈاکٹر صاحب سے خواہش کی کہ وہ معاشی موضوعات پر دینی مدارس کے طلبہ کے لئے نہ صرف محاضرات دیں، بلکہ انہیں مرتب بھی کردیں تاکہ یہ ایک رہنما کتاب کی حیثیت سے ان کے سامنے رہے، چنانچہ اسی سلسلہ میں ان محاضرات کا مجموعہ شائع کیا جارہا ہے۔ اس مجموعہ میں پانچ محاضرات شامل کئے گئے ہیں، پہلے تین لیکچرز علم معاشیات اور جدید مالیاتی نظام کے موضوع پر ہیں، جس میں اختصار کے ساتھ علم معاشیات اور اس کے مبادی اصولوں کے بیان کے ساتھ اسلامی معاشیات کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں اسلامی مفکرین کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز جدید معاشی نظاموں کے پس منظر میں اسلام کے اقتصادی اصولوں کو واضح کیا گیا ہے۔

چوتھا خطبہ ہندوستان میں غیر سودی مالیاتی نظام سے متعلق ہے، اس کا عنوان ہے: ''ہندوستان میں اسلامی مالیات، موجودہ مسائل اور امکانات''، یہ خطبہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے خاص ہندوستان کے پس منظر میں ہے، جس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتصادی حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے، نیز اس ملک میں اسلامی بینک کاری کے امکانات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، اور اس ضمن میں بعض اداروں کا تعارف بھی آ گیا ہے۔

پانچواں محاضرہ ''اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک'' کے عنوان سے ہے، اس محاضرہ میں اقلیت کی تعریف، مسلم اقلیتی مما لک میں اسلامی بینک کاری کی کوششیں اور اس راہ میں حائل دشواریوں کا تجزیہ کیا گیا ہے، نیز موجودہ عہد میں 'دار' یعنی نظام حکومت کی تقسیم کی گئی ہے، اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی حقیقت کیا ہے

اور موجودہ جمہوری ممالک کس زمرہ میں آتے ہیں؟ پھر دار الحرب میں سود کے فقہی حکم پر بحث کی گئی ہے اور اہل علم کے نقاط نظر کا تجزیہ کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں یہ بات ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی وضاحت کو ایک عالم کے فتوی کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، تاہم جو موقف انہوں نے اختیار کیا ہے، علماء ہند کا فتوی اس کے مطابق ہے، اور اکیڈمی نے بھی اپنے تیسرے سمینار میں یہی فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان جیسے ممالک میں بھی سود حرام ہے۔

یہ مجموعہ اس لئے شائع کیا جارہا ہے کہ مدارس کے نوجوان فضلاء اس سے استفادہ کریں، نیز مدارس سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اسے اپنے یہاں منتہی جماعتوں کے طلبہ کے لئے مطالعاتی نصاب میں شامل کردیں، تاکہ ہمارے فضلاء اپنے عہد کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہوسکیں، اکیڈمی کوشاں ہے کہ جیسے اس نے ماضی میں علماء اور دینی مدارس کے طلبہ کی رعایت سے عصری موضوعات پر بعض رسائل پیش کئے ہیں، اسی طرح دوسرے عصری موضوعات پر بھی محاضرات کا نظم کرے اور انہیں مرتب کرکے شائع بھی کرے تاکہ ان سے مستقل طور پر فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اکیڈمی اس بات کے لئے بھی کوشاں ہے کہ عصری درسگاہوں میں بھی اسلامی زندگی کے مختلف شعبوں پر محاضرات رکھے جائیں؛ تاکہ وہاں تعلیم پانے والے طلبہ میں دینی شعور پیدا ہو اور وہ عصری علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ راسخ العقیدہ مسلمان بھی بنیں، قارئین دعا کریں کہ اللہ تعالی اکیڈمی کی ان کوششوں کو قبول فرمائے اور نتیجہ خیز بنائے۔ واللہ ھو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۷؍ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ

۱۳؍اپریل ۲۰۰۹ء

دیباچہ

یہ مختصر سا کتابچہ ۵ مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف وقتوں میں لکھے گئے اور اردو کے علمی رسالوں بالخصوص تحقیقات اسلامی (علی گڈھ) اور مطالعات (نئی دہلی) کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے۔

گذشتہ دنوں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے بعض مدارس میں معاشی موضوعات پر لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا تو انہیں مضامین پر تکیہ کیا گیا۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ دار حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے فرمائش کی کہ اگر ان لیکچروں کو شائع بھی کر دیا جائے تو طلباء ان کو ''رہنما کتاب'' کی حیثیت سے استعمال کر سکیں گے۔ ناچیز کا جرم صرف اتنا ہے کہ اُس نے اِس فرمائش سے سرتابی کرنے کی جرأت نہیں کی بلکہ حکم کی تعمیل کو اپنا فرض جانا۔

اگر اس مختصر مجموعے میں کوئی خوبی نظر آئے تو اس کے لئے مولانائے مذکور دعائے خیر کے بجا طور پر مستحق ہوں گے۔ خامیوں کے لئے خادم ذمہ دار ہے۔

تاہم اگر ان خامیوں کی اطلاع دے دی جائے تو انشاء اللہ اگلی اشاعت میں تصحیح کی کوشش کی جائے گی۔

اوصاف احمد

۲؍اپریل ۲۰۰۹ء

B-89 Sector-27

Noida

علم معاشیات

تعریف، مقصد اور منہاج

موجودہ زمانہ میں معاشیات کی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور معاشیات سے تعلق رکھنے والے موضوعات ہماری روزمرہ کی گفتگو، بات چیت اور بحث مباحثے کا مرکز بنتے جارہے ہیں۔ اگر ہم اپنے گردوپیش کی زندگی پر نظر ڈالیں تو یہ سمجھ لینا غالباً چنداں دشوار نہ ہوگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ گھروں کی چار دیواری میں رہنے والی خواتین اکثر حیران رہتی ہیں کہ قیمتوں میں مسلسل اضافہ کیوں ہوتا رہتا ہے۔ آج سے تیس چالیس سال قبل آلو کی قیمت 50 پیسے فی کلو ہوا کرتی تھی لیکن آج اس کی قیمت 8 روپئے فی کلو ہے۔ اس زمانے میں شکر ایک روپیہ فی کلو ہوا کرتی تھی آج اس کی قیمت 30 روپیہ فی کلو ہے، اسی طرح دوسری ضروریات زندگی کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں اور روپئے کی خریدنے کی طاقت کم ہوگئی ہے۔ بعض اوقات انھیں یہ جان کر بھی حیرانی ہوتی ہے کہ کچھ چیزیں بازار میں دستیاب نہیں ہیں۔ کبھی صابن غائب ہے تو کبھی بناسپتی گھی نہیں مل رہا ہے۔ ایسے مواقع پر معمول سے زیادہ رقم دے کر چیز لینی پڑتی ہے۔

کالجوں میں پڑھنے والے طلباء کے سامنے روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ آپس میں اس بات پر بحث مباحثہ کرتے رہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد کس قسم کی زندگی گذارنا پسند کرے گا۔ کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو کوئی قانون داں، کوئی آئی اے ایس بننا چاہتا ہے تو کوئی یونیورسٹی میں لیکچرار ہونا چاہتا ہے۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد زندگی کی تلخ حقیقتوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بے روزگاروں کے دفتر میں نام لکھوانے

پہنچتے ہیں تو اپنے ہی جیسے سیکڑوں لوگ روزگار کی تلاش میں لائن لگائے ہوئے ملتے ہیں۔ اول تو انٹرویو کے لئے بلاوے ہی نہیں آتے۔ اور اگر آتے بھی ہیں تو روزگار نہیں ملتا۔ وہ بس یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بے روزگاری زیادہ ہے۔

بعض دوسرے ممالک میں بے روزگاری کی یہ صورت حال نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہاں کام کرنے والوں کی کمی ہے۔ اس لئے وہ دوسرے ملکوں سے کام کرنے والے منگاتے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ ہمارے ملک سے بہت سے لوگ مشرق وسطیٰ کے ممالک، سعودی عرب، عراق، شام، لیبیا اور خلیج فارس کے ممالک، جیسے بحرین، قطر، دوبئی، ابوظہبی وغیرہ ہجرت کر گئے ہیں۔ ان میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں لیکن ہنر مند ہیں۔ کوئی لکڑی کا کام جانتا ہے، کوئی فرنیچر بناتا ہے، کوئی مشین مین ہے، کوئی پینٹر ہے، کچھ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے کوئی ڈاکٹر ہے۔ کوئی انجینئر ہے، کوئی کمپیوٹر کا ماہر ہے، آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ یہ صورت حال کیسے پیدا ہوسکتی ہے کہ بعض ملکوں میں روزگار کی اس قدر کمی ہو اور دوسرے ممالک میں اس قدر فراوانی ہو؟

آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ مختلف پیشوں میں تنخواہ کی شرح الگ الگ ہوتی ہے، عمارتوں کی تعمیرات میں کام کرنے والا مزدور عام طور پر 20-10 روپئے روز سے زیادہ نہیں کماتا جبکہ اس کے ساتھ ہی کام کرنے والا راج گیر پچاس روپئے روز کماتا ہے، اسی پروجیکٹ پر کام کرنے والے انجینئر کی تنخواہ کئی ہزار روپئے ماہوار ہوتی ہے، تنخواہ کے علاوہ بھی اسے مختلف طرح کی سہولیات مل سکتی ہیں مثلاً رہنے کے لئے مفت بنگلہ، کمپنی کی کار اور گھر میں کام کرنے کے لئے خدمت گار وغیرہ، کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ مختلف پیشوں کے درمیان آمدنی میں یہ تفاوت کس بناء پر ہے؟

شائد یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ ہندوستان میں ہم اپنی ضرورت کی تمام چیزیں نہیں بنا پاتے ہیں اور بہت سی چیزیں ہمیں دوسرے ممالک سے خریدنا پڑتی ہیں۔ یعنی ہم دوسرے ملکوں

سے درآمد کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سی چیزیں ہم دوسرے ملکوں کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں، اس قسم کی تجارت کو غیر ملکی تجارت یا بین الاقوامی تجارت کہتے ہیں، ہم کوئی وجوہات کی بنا پر درآمد کرنا پڑتا ہے۔ ہم اپنی برآمد کو کس طرح بڑھا سکتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی ملک بین الاقوامی تجارت کے بغیر رہ سکے اور ترقی کر سکے؟

اور پھر ترقی کا کیا مفہوم ہے، کیا آزادی کے بعد سے ہم نے کچھ ترقی کی ہے یا نہیں؟ معاشی ترقی کا معیار کیا ہے۔ دنیا میں کون سے ملک ہیں جو ترقی یافتہ کہے جا سکتے ہیں، ان ممالک نے ترقی کا یہ زینہ کیونکر طے کیا؟ اس راہ میں ان کو کون کون سی دشواریاں پیش آئیں، کیا اب ان ترقی یافتہ ممالک کے تمام معاشی مسائل حل ہو گئے یا اس ترقی کے باوجود معاشی مسائل ان ممالک میں باقی ہیں؟ اگر معاشی مسائل باقی ہیں تو معاشی ترقی کا حاصل کیا ہے، ان موجودہ مسائل کی نوعیت کیا ہے اور کس طرح ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے؟

غیر ترقی یافتہ ممالک کے معاشی مسائل کیا ہیں؟ یہ ممالک ترقی کیوں نہیں کر سکے، ان کی معاشی ترقی کی راہ میں کون سی دشواریاں حائل ہیں اور ان کو کس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے؟ معاشی ترقی میں کون سے عوامل مدد دے سکتے ہیں، کیا ان ممالک کا سماجی ڈھانچہ، رسم و رواج اور طرز زندگی معاشی ترقی کے منافی ہیں؟

حکومت اور معاشی زندگی کا کیا تعلق ہے؟ کیا حکومت کے افعال و اعمال ہماری معاشی زندگی پر کس طرح کا اثر ڈالتے ہیں؟ حکومت کو کس طرح کا کام اپنے ذمہ لینے چاہیے اور کس طرح کی سرگرمیوں سے احتراز کرنا چاہیے؟ حکومت اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے اپنے اخراجات کس طرح پورے کرے؟ اس کی آمدنی کن ذرائع سے حاصل ہو؟ کیا معاشی زندگی کی کارکردگی کے لئے حکومت پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا نہیں؟

یہ وہ چند سوالات ہیں جو علم معاشیات کے دائرے میں آتے ہیں اور جنھوں نے

ہمارے زمانے میں ماہرین معاشیات کی توجہ اپنی جانب مبذول رکھی ہے، معاشی نظریات، کسی نہ کسی طور پر انھیں سوالات کے تشفی بخش جوابات پانے کی جستجو اور کوشش کرتے ہیں۔

علوم کی تقسیم-قدرتی اور سماجی علوم

دنیا میں جو کچھ بھی 'معلومات' (Knowledge) انسانوں نے اپنے پیش رووں سے سیکھ کر اور بذات خود جمع کی ہے اس کو عام طور پر دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱-فنون

۲-علوم

علوم اور فنون کے درمیان فرق مثالوں کے ذریعہ بہتر طریقے پر واضح کیا جاسکتا ہے، مصوری، موسیقی، اداکاری، شاعری، فن تعمیرات، وغیرہ فنون کی مثالیں ہیں، ان فنون میں کارنامے انجام دینے کے لئے انسان میں کسی حد تک خداداد قابلیت کا ہونا ضروری ہے، گو کہ دورِ جدید میں ان فنون کو سکھانے کے لئے بھی ادارے (مثلاً آرٹس کالج وغیرہ) کھل گئے ہیں لیکن وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ایک شخص میں ان فنوں کو سمجھنے کی زیادہ اہلیت پیدا کردیں۔ لیکن ایک مصور بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس شخص کی طبیعت کو مصوری سے فطری مناسبت ہو۔ اگر یہ فطری مناسبت اس کی طبیعت میں ودیعت نہیں کی گئی تو کوئی اعلیٰ درجہ کے ادارے مل کر بھی اس شخص کو مصور نہیں بنا سکتے۔ یہی بات موسیقی، اداکاری، رقص اور شاعری کے لئے کہی جاسکتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ بنائے نہیں جاتے۔ یہ فنون لطیفہ کی مثالیں ہیں۔ کچھ دوسرے فنون بھی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے فن نہیں سمجھے جاتے جیسے فن طباخی (مشہور ہے کہ عمدہ کھانا پکانا بھی ایک آرٹ ہے) فن خیاطی، فن خطاطی وغیرہ۔

علم، ہماری معلومات کا وہ حصہ ہے جس کو سائنسی انداز پر منضبط کیا گیا ہو۔ ان علوم کو سیکھنے کے لئے کسی خاص قابلیت یا فطری مناسبت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اوسط درجہ کی ذہانت

اور مناسب تربیت کی ضرورت ہے۔ علوم کی دو بڑی قسمیں کی جاسکتی ہیں:

(i)-قدرتی علوم

(ii)-سماجی علوم

قدرتی علوم وہ ہیں جن میں انسان اس کائنات، اور اس دنیا کے بارے میں تفتیش کرتا ہے جس کا ایک جزو وہ خود بھی ہے، طبیعات میں اشیاء کی طبعی ماہیت اور کائنات کے طبعی پہلو سے بحث کی جاتی ہے، علم کیمیا اشیاء کی کیمیاوی ترکیب کی تفتیش کرتا ہے، حیوانیات، دنیا میں پائے جانے والے حیوانوں کا مطالعہ کرتا ہے، علم بناتات میں مختلف قسم کے پودوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ارضیات، زمین کی بناوٹ کی چھان بین کرتا ہے، فلکیات میں اجسام فلکی، ستاروں اور سیاروں کی صفات کی تفتیش کی جاتی ہے۔ غرضیکہ اس کائنات سے متعلق کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے مطالعہ کی خاطر انسانوں نے کسی نہ کسی علم کو مختص نہ کر دیا ہو۔

قدرتی علوم کے برعکس، سماجی علوم وہ ہیں جس میں انسانوں کی تنظیم' جسے ہم سماج کہتے ہیں' کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ قدرتی علوم کا موضوع کائنات ہے لیکن سماجی علوم کا موضوع خود انسان ہے۔ جس طرح قدرتی علوم کی مختلف شاخیں ہیں اور ہر شاخ قدرت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح سماجی علوم کی بھی مختلف شاخین ہیں جو سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ علم سیاسیات انسانی زندگی کے سیاسی پہلو پر زور دیتا ہے، یہ اس بات کی کھوج کرتا ہے کہ ریاست اور حکومت کا آغاز کب ہوا۔ ریاست کے مختلف روپ کیا ہیں۔ اچھی ریاست کسے کہتے ہیں، ریاست میں شہریوں کے حقوق وفرائض کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علم سماجیات کا موضوع انسانی زندگی کا سماجی پہلو ہے۔ یہ اس بات کی تفتیش کرتا ہے کہ سماج کیسے قائم ہوا۔ اچھے سماج کی صفات کیا ہیں۔ سماج کے مختلف عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ کسی سماج کے رسم ورواج کیسے ہیں؟ کس قسم کی سماجی اقدار، اس سماج میں رائج ہیں، اقدار کا یہ نظام فرد اور سماج کی ترقی میں مدومعاون ہے یا متحارب؟

سماجیات اور سیاسیات کی طرح معاشیات بھی ایک سماجی علم ہے۔ جس طرح سیاسیات انسان کی سیاسی زندگی اور سماجیات انسان کی سماجی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشیات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشیات، انسان کی معاشی زندگی کا مطالعہ ہے۔ لیکن صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ معاشیات، انسان کی معاشی زندگی کا احاطہ کرتا ہے کیونکہ بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم انسان کی معاشی اور غیر معاشی زندگی یا اس کے معاشی اور غیر معاشی افعال کے درمیان حد فاصل کس طرح قائم کریں۔ معاشی اور غیر معاشی سرگرمیوں کے درمیان امتیاز اس لئے ضروری ہے تاکہ معاشیات کا وجود ایک علیحدہ علم کی حیثیت سے قائم ہو سکے۔ اگر ہم سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق معلومات اور اعداد و شمار جمع کر دیں اور اس بات کی قطعی پرواہ نہ کریں کہ مفید اور متعلق معلومات کون سی ہیں نیز غیر متعلق اور غیر مفید معلومات کون سی۔ تو ہم اعداد و شمار یا معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ اکٹھا کر دیں گے جو اپنے حجم کے لحاظ سے تو چاہے جتنا عظیم کیوں نہ ہو لیکن چنداں بامعنی نہ ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم مفید اور غیر مفید، متعلق (Relevant) اور غیر متعلق معلومات کے درمیان تفریق کریں۔ یکساں معلومات کو ایک جگہ جمع کریں۔ معلومات کی درجہ بندی علمی انداز فکر کا پہلا اصول ہے، یکساں معلومات کو ایک جگہ جمع کرنے کے بعد ہم ان کی چھان پھٹک اور ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ تجزیہ کے بعد ہم ان میں سے عام اصول اخذ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم معاشیات کی ایک تعریف مقرر کریں تاکہ یہ تعریف ہمیں انسان کی معاشی اور غیر معاشی سرگرمیوں میں امتیاز کرنے کے لئے کوئی بنیاد فراہم کر سکے۔ تب ہی ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انسان کی سماجی زندگی سے متعلق مختلف قسم کی تفصیلات میں سے کون سی ہمارے لئے مفید اور متعلق ہیں اور کون سی غیر مفید اور غیر متعلق۔

معاشیات کی تعریف

دوسرے علوم کی بہ نسبت معاشیات ایک جدید علم ہے گو کہ معاشی خیالات اور معاشی

افکار کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم خود موجودہ تہذیب، مختلف قسم کے معاشی افکار و تصورات ہمیں پہلی بار افلاطون کی ''ریاست'' میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد سے مختلف فلسفی، دانشور، اور اہل فکر حضرات جن میں بسا اوقات تاجر، ملازمت پیشہ اور حکام بھی شامل ہیں، مختلف اوقات میں معاشیات کے موضوعات کے بارے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ تیرہویں سے پندرہویں صدی عیسوی تک یہ خیالات تجارت پسندی کے فلسفہ میں اور اس کے بعد زراعت پسندی کے فلسفہ میں ظاہر ہوئے لیکن نہ تو تجارت پسندوں نے اور نہ زراعت پسندوں نے بہ حیثیت علم معاشیات کی تدوین میں کامیابی حاصل کی۔ معاشیات کی پہلی کتاب ایڈم اسمتھ نے ''دولت اقوام کے اسباب وعلل کی ایک جستجو'' [An Inquiry into Nature and Causes of Wealth of Nations] کے عنوان سے 1776ء میں شائع کی۔ (۱) یہ کتاب 'دولتِ اقوام' (Wealth of Nations) کے مختصر نام سے ہی مشہور ہے۔ اس طرح معاشیات کی تاریخ کم وبیش دوسو سال کی تاریخ ہے۔ اس عرصے میں معاشیات کی مختلف طرح سے تعریفیں کی گئیں، کبھی اسے ''دولت کا علم'' کہا گیا۔ (۲) کبھی اسے ''چٹنی روٹی کا علم'' (Bread & Butter Slience)، کا طعنہ دے کر اس کی تحقیر کرنے کی کوشش کی گئی (۳)۔ مارشل اور پیگو جیسے ماہرین معاشیات نے اس افراط وتفریط کے درمیان متوازن نقطۂ نظر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پروفیسر الفریڈ مارشل نے معاشیات کی تعریف اس طرح کی ہے:

> ''سیاسی معیشت یا معاشیات، زندگی کے روزمرہ معمولات کے طور پر انسانی اعمال کا مطالعہ ہے۔ یہ اس بات کی تفتیش کرتا ہے کہ انسان کس طرح اپنی آمدنی حاصل کرتا ہے اور کس طرح اس کا استعمال کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو یہ دولت کا مطالعہ ہے اور دوسری طرف، جو زیادہ اہم ہے، یہ انسان کے مطالعہ کا ایک حصہ ہے۔ (۴)

معاشیات کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر پیگو لکھتے ہیں:

''معاشیات انسان کے مادی بہبود کا علم ہے...... مادی بہبود، سماجی بہبود کا وہ حصہ ہے جس کو زر کے ذریعہ ناپا جا سکتا ہے۔''(۵)

تاہم عہد جدید کے ماہرین معاشیات کے نزدیک، کسی نہ کسی سبب سے یہ تعریفیں قابل قبول نہیں ہیں۔ جدید عہد میں معاشیات کی جس تعریف کو قبولِ عام حاصل ہوا، اور جس کو جدید ماہرین ماہرین معاشیات عام طور پر تسلیم کرتے ہیں وہ لارڈ رابنس کی تعریف ہے۔ اس مضمون میں ہم بھی اس تعریف کی پیروی کریں گے۔ لارڈ رابنس کے مطابق:

''معاشیات، مقاصد اور قلیل وسائل، جن متبادل استعمال ہو سکتے ہیں، کے رشتہ کے طور پر انسانی برتاؤ کا مطالعہ ہے''۔(٦)

اس تعریف کو سمجھنے کے لئے ہمیں بعض اصطلاحات کے معنی سمجھنے ہونگے جن کا استعمال اس تعریف میں کیا گیا ہے۔

مقاصد: ہر عمل کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، اسی طرح معاشی اعمال کا بھی کوئی مقصد ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک صارف مختلف چیزوں کے استعمال سے زیادہ سے زیادہ تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایک فرم زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے، ایک ملک اس بات کے لئے کوشاں رہتا ہے کہ اس کی قومی آمدنی میں جتنا ممکن ہو اضافہ ہو سکے وغیرہ، اس لئے معاشی اعمال کے مقصد کی نشان دہی ضروری ہے۔

وسائل: کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر ہم بھوک کی تسکین چاہتے ہیں تو روٹی ایک وسیلہ ہے۔ روٹی تیار کرنے کے لئے گیہوں کی ضرورت ہے تو گیہوں بھی ایک وسیلہ ہے، گیہوں خریدنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے تو روپیہ بھی ایک وسیلہ ہے، کوئی فرم اگر اپنی پیداوار میں اضافہ کرنا چاہتی ہے تو اس کو زیادہ مشینوں' زیادہ مزدوروں اور زیادہ کچے مال کی ضرورت ہے، یہ سب وسائل ہیں۔ اس طرح وسیلہ کی تعریف

یہ ہوسکتی ہے کہ یہ وہ اشیاء ہیں جن کے ذریعہ براہِ راست کسی ضرورت کی تسکین ہوسکتی ہے یا وہ ایسی اشیاء کے پیدا کرنے میں مدد دے سکتی ہیں جو ضرورت کی براہِ راست تسکین کے کام آسکیں۔

قلیل وسائل: معاشی زندگی کی سب سے اہم حقیقت یہ نہیں ہے کہ ضروریات کی تسکین کے لئے وسائل مہیا ہیں بلکہ یہ ہے کہ وسائل قلیل مقدار میں مہیا ہیں۔ قلت ہی وہ خصوصیت ہے، جس کی بنیاد پر مختلف اشیاء میں یہ فرق کیا جاسکتا ہے کہ وہ معاشی اشیاء ہیں یا نہیں۔ انسان کو زندہ رہنے کے لئے سانس لینے کی ضرورت ہے۔ سانس لینے کے لئے صاف ہوا ضروری ہے۔ لیکن ہوا کی خرید وفروخت کہیں بھی نہیں ہوتی، کیونکہ فطرت نے اس زمین کے گرد جو کرۂ ہوائی بنایا ہے اس میں ہوا وافر مقدار میں موجود ہے۔ انسانی زندگی کی بقا کے لئے سورج کی روشنی اور حدت بھی ضروری ہے لیکن یہ بھی وافر مقدار میں موجود ہے اس لئے یہ اشیا ''مفت'' اشیا کہلاتی ہیں، ان کے برعکس دوسری اشیاء جو قلیل مقدار میں ہیں وہ ''معاشی اشیاء'' کہلاتی ہیں، زمین قلیل مقدار میں ودیعت کی گئی ہے، کرۂ زمین پر 3/4 حصہ پانی ہے اور صرف 1/4 حصہ زمین، اس میں سے ریگستان، پہاڑوں اور بنجر زمین کی مقدار نکال دی جائے تو قابل استعمال زمین کی مقدار اور بھی کم ہوجائے گی۔ اس لئے زمین، روشنی اور ہوا کی طرح ''مفت'' نہیں ہے بلکہ اس کے استعمال کے لئے ''قیمت'' دینی پڑتی ہے، یہی حال تمام معاشی اشیاء کا ہے، اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قلیل وسائل کا مطلب فی الحقیقت ''معاشی وسائل'' سے ہے، اور معاشی وسائل وہ وسائل ہیں جن کی مقدار محدود اور قلیل ہے۔

متبادل استعمال: متبادل استعمال کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ایک وسیلہ کو ایک سے زیادہ مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ زمین ایک معاشی وسیلہ ہے۔ لیکن اس کا استعمال ایک سے زیادہ ضروریات کے لئے ممکن ہے، ایک قطعہ آراضی پر رہنے کے لئے مکان تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ اس پر ایک صنعتی کارخانہ بھی کھڑا کرسکتے ہیں، یا اس پر کسی فصل کی کاشت کی جاسکتی

ہے۔ یا اسے سڑک بنانے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ سب زمین کے متبادل استعمال ہیں۔ یہی حال کم وبیش تمام معاشی وسائل کا ہے کہ ان کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اب اس کو کس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے؟ علم معاشیات اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے، یہ تو بدیہی ہے کہ زمین کے اس ٹکڑے (یا کسی دوسرے معاشی وسیلہ) کو بہ یک وقت تمام مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ہمیں اپنی ضروریات میں سے کچھ یا بعض ضرورتوں کا انتخاب کرنا پڑے گا جس کے پورا کرنے کے لئے کسی دیئے گئے معاشی وسیلہ (یا وسائل) کا استعمال کیا جاسکے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو معاشیات، انتخاب کا علم (Science of Choice) بن جاتا ہے، معاشیات کا منصب یہ ہے کہ وہ ہمیں ایسا انتخاب کرنے میں مدد دے جو عقلی (Rational) ہو اور وسائل کو بہترین طریقے پر استعمال کرتا ہو۔

آیئے اس مسئلہ کو ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کریں۔ فرض کر لیجئے کہ ایک طالب علم کو 3,000 روپیہ ماہانہ جیب خرچ ملتا ہے۔ اس کی یہ آمدنی محدود ہے، یہ آمدنی اس طالب علم کے لئے معاشی وسیلہ ہے جن کی مدد سے اسے اپنی چند یا ممکنہ طور پر تمام ضروریات کی تسکین کرنی ہے۔ لیکن طالب علم کی ضروریات بے شمار ہیں۔ اسے کالج کی فیس ادا کرنی ہے۔ کتابیں خریدنی ہیں۔ اپنی قیامگاہ کا کرایہ ادا کرنا ہے، ایک ماہ کے لئے خورد ونوش کا انتظام کرنا ہے۔ لیکن ان محدود معاشی وسائل کے متبادل استعمال بھی ہیں، وہی طالب علم ان روپیوں سے ایک موبائل فون بھی خرید سکتا ہے۔ گرمی سے بچنے کے لئے بجلی کا ایک پنکھا خرید سکتا ہے، یا اس رقم کو مختلف قسم کے اعلیٰ ریستورانوں میں ناشتہ کرنے، فلمیں دیکھنے اور تفریح کرنے میں صرف کرسکتا ہے، محض اس حقیقت کے باعث کہ اس کے وسائل محدود یا قلیل ہیں وہ اپنی تمام ضروریات کی تسکین بہ یک وقت نہیں کرسکتا۔ اس لئے اسے اپنی ضرورتوں میں سے چند اہم ضرورتوں کا انتخاب کرنا ہوگا جن کی وہ تسکین کرسکتا ہے اور بقیہ تمام ضرورتوں کی تسکین کو ملتوی کردے گا، اس

طرح اس کے سامنے انتخاب کا مسئلہ ہے یعنی وہ کن چیزوں اور خدمات کی خریداری کرے کہ اس سے طالب علم کو بیش ترین افادہ یا فلاح حاصل ہو سکے۔

اس طالب علم کی طرح ہی کسی سماج کے معاشی وسائل بھی قلیل ہوتے ہیں، ہر ملک کے پاس مشینوں، خام مواد، اور محنت کی ایک محدود مقدار ہوتی ہے جس کے ذریعہ اسے ہر اس چیز کی پیداوار کرنی ہے جس کی اسے ضرورت ہے، ظاہر ہے کہ کوئی ملک ان تمام چیزوں کی اتنی مقدار میں پیداوار نہیں کر سکتا جتنی کہ اسے ضرورت ہے، یا جتنی مقدار میں وہ پیداوار کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ وسائل جن کی مدد سے یہ پیداوار کی جا سکتی ہے اپنی نوعیت کے لحاظ سے محدود ہیں۔ فرض کیجئے کہ بعض چیزوں کی اشد ضرورت ہے لیکن ایسا کرنے کے لئے ملک کے پاس ضروری تکنیکی لیاقت، خام مواد، مشینری وغیرہ نہیں ہے تو بھی اس کے سامنے یہ راستہ کھلا ہے کہ ان اشیاء کو کسی دوسرے ملک سے درآمد کر لے۔ لیکن اس صورت میں بھی اسے ان اشیاء کی قیمت غیر ملکی زر مبادلہ میں ادا کرنی ہوگی لیکن غیر ملکی زر مبادلہ کے وسائل بھی محدود ہوتے ہیں جب درآمد کی جانے والی اشیاء کی تعداد اور مقدار خاص ہو سکتی ہے اس لئے کوئی ملک لامحدود اشیاء کی لامحدود مقدار میں درآمد بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں پھر ہمارا سامنا انتخاب کے مسئلہ یعنی معاشی مسئلہ سے ہے کہ کوئی ملک کن اشیاء کی پیداوار اندرونِ ملک کرے، اور کن اشیاء کو کتنی مقدار میں بیرونی ممالک سے درآمد کرے۔

معاشی زندگی کی بنیادی حقیقت قِلّت (Scarcity) ہے۔ قلت کی وجہ سے ہی معاشی مسائل وجود میں آتے ہیں۔ وہ تمام اشیاء جو قلیل مقدار میں ودیعت کی گئی ہیں معاشی اشیاء کہلاتی ہیں۔ اس طرح زمین، محنت، سرمایہ، مختلف قسم کی اشیائے صرف، مشینیں، مختلف قسم کی لیاقتیں معاشی اشیاء کی مثالیں ہیں کیونکہ یہ سب ہی قلیل مقدار میں فراہم ہیں۔ معاشی اشیاء کی ایک خاصیت یہ ہے کہ صرف ان ہی کے لئے بازار میں قیمت ادا کی جاتی ہے۔ اگر کسی صورت سے معاشی اشیاء بھی سورج کی روشنی اور ہوا کی طرح وافر مقدار میں مہیا ہو جائیں تو وہ بھی مفت اشیاء

بن جائیں گی اور کوئی بھی شخص ان کے لئے کسی قیمت کی ادائیگی کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

ہوا اور سورج کی روشنی صرف اس لئے مفت اشیاء ہیں یہ وافر مقدار میں مہیا ہیں۔ (حالانکہ بہت سے صنعتی مراکز میں آج کل صاف ہوا بھی قلیل مقدار میں ہی مہیا ہے) ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ قلت کسی معاشی شے کی ذاتی خاصیت نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص صورت حال کی خاصیت ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی خاص شے ایک صورت حال میں قلیل نہ ہو اور اس لئے معاشی شے نہ ہو لیکن ایک دوسری صورت حال میں اسی شے میں قلت کی خاصیت پیدا ہو جائے اور معاشی شے کی طرح اس کی خرید و فروخت ہونے لگے۔ مثلاً پانی کو عام طور پر ایک مفت شے خیال کیا جاتا ہے اور اس کی کوئی قیمت نہیں لیتا کیونکہ یہ وافر مقدار میں موجود ہے لیکن ہندوستان میں گرمی کے موسم میں ٹھنڈا پانی ایک معاشی شے بن جاتا ہے اور اس کی قیمت وصول کی جاسکتی ہے۔ بہشت کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ انسان جو کچھ بھی خواہش کرے گا وہ چشم زدن میں اسے حاصل ہو جائے گا۔ اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے، بہشت میں کسی معاشی مسئلہ کا وجود نہ ہوگا۔ ہندو دیو مالا میں ایک ایسے درخت کا تذکرہ ملتا ہے کہ جس کے نیچے بیٹھ کر جو خواہش ظاہر کی جائے پوری ہو جائے گی۔ اگر حسن اتفاق سے ایسے درخت جا بجا پیدا ہو جائیں تو دنیا میں کوئی معاشی مسئلہ باقی نہ رہے گا اور غالباً جس روز یہ وقوعہ ظہور پذیر ہو اس کے دوسرے ہی دن سے یونیورسٹیوں میں معاشیات کی تدریس ختم ہو جائے گی۔ (اس سے ماہرین معاشیات کے بے روزگار ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ بھی ان درختوں سے ہی اپنی تمام خواہشات کی تسکین کر سکتے ہیں اس لئے اس چھوٹے سے گروہ کے لئے بھی فی الحقیقت معاشی مسئلہ کا خاتمہ ہو جائے گا)۔

اس لئے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ معاشی مسائل کے وجود کا سبب قلت ہے۔ اگر قلت ختم ہو جائے تو معاشی مسائل کا وجود نہ رہے گا۔ رکارڈو کے الفاظ میں ''فطرت کی بخالت'' (niggardliness of nature) معاشی مسائل کے وجود کی ذمہ دار ہے اگر فطرت بخیل ہونے کے بجائے فیاض ہوتی اور تمام وسائل لامحدود اور بے انتہاء ہوتے تو معاشی مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔

معیشت کا مفہوم

ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ انسانوں کے معاشی اعمال، ایک سماجی تنظیم کے دائرے کے اندر رہ کر ہی منتظم کیے جاسکتے ہیں، انسانوں کی معاشی تنظیم کو معیشت کہتے ہیں۔

ہر علم میں بعض ایسے بنیادی تصورات ہوتے ہیں جن کا وجود، بدیہی تسلیم کیا جاتا ہے اور شک وشبہ سے بالاتر ہوتا ہے۔اس قسم کے تصورات کو مبادی (Primitive) کہتے ہیں۔طبعیات میں مادہ، سیاسیات میں ریاست، اور سماجیات میں سماج ایسے ہی مبادی ہیں۔ اسی طرح معاشیات میں معیشت بھی مبادی ہے۔علم معاشیات کے بعض دوسرے پہلوؤں پر بحث کرنے سے پہلے ہمارے لئے یہ مفید ہوگا اگر ہم معیشت کا مفہوم سمجھ لیں۔

ایک اصطلاح کے طور پر معیشت سے ہمارا مفہوم ایک ایسے مربوط نظام سے ہے جس کے ذریعہ سماج مختلف معاشی اعمال انجام دیتا ہے۔یعنی مختلف قسم کی اشیاء اور خدمات کی پیداوار کرتا ہے اور پھر انھیں اپنے ممبروں کے درمیان صَرف کے لئے تقسیم کرتا ہے، اس طرح معاشیات اس بات کا مطالعہ ہے کہ معیشت کیسے کام کرتی ہے۔

معیشت افراد، گھرانوں اور بیوپاری فرموں سے مل جل کر بنی ہے۔ایک فرد معیشت کی سب سے چھوٹی اکائی ہے، ایک فرد کو اپنی زندگی میں بعض اہم ترین فیصلے کرنا ہوتے ہیں مثلاً وہ کس قسم کی تعلیم وتربیت حاصل کرے گا؟ کس پیشے کو اختیار کرے؟ کس جگہ کام کرے؟ کس جگہ اور کیسے مکان میں رہائش اختیار کرے وغیرہ۔عام طور پر یہ فیصلے معاشی عوامل کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔معیشت کی دوسری بڑی اکائی گھرانہ ہے۔ ایک گھرانہ ان افراد کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر، اپنی ضروریات کی تسکین کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس تسکین کا سامان بھی مل جل کر فراہم کرتے ہیں۔ہمارے ملک میں گھرانہ کی عام تعریف یہ ہے کہ ایک گھرانہ ان افراد سے مل کر بنتا ہے جو ایک دوسرے سے شادی یا خون کے رشتہ سے بندھے ہوں اور ایک مشترکہ

باورچی خانہ سے منسلک ہوں۔ مردم شماری کمیشن ہر دس سال پر ملک کی مردم شماری کرتا ہے اور بہت سی مفید معاشی وسماجی معلومات بھی جمع کرتا ہے۔ مردم شماری کمیشن نے گھرانہ کی مندرجہ بالا تعریف پر عمل کرتے ہوئے یہ معیار مقرر کیا ہے وہ تمام لوگ جن کا کھانا ایک چولہے پر پکتا ہے وہ مردم شماری کے مقاصد کے خاطر ایک گھرانہ تصور کیے جائیں گے۔ اس طرح دو خاندان جو ایک چھت کے نیچے رہتے ہوں، لیکن اگر ان کے چولہے الگ الگ ہیں تو وہ دو گھرانے متصور ہونگے۔ یا ایک خاندان کے افراد بھی، خواہ وہ خونی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، اور ایک ہی مکان میں مقیم کیوں نہ ہوں، اگر دو یا دو سے زیادہ چولہے رکھتے ہوں تو وہ الگ الگ گھرانے سمجھے جائیں گے۔ گھرانہ بنیادی طور پر صرف کرنے والی اکائی ہے۔ دوسری طرف فرم بھی ایک گھرانہ ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ پیداواری اکائی ہے۔ ایک فرم ان افراد یا افراد کے گروہوں کا مجموعہ ہے جو ان اشیاء یا خدمات کی پیداوار کرتے ہیں جن کی افراد یا گھرانوں کو صرف کے لئے ضرورت ہوتی ہے، فرم اپنے معاشی وظائف، سماجی خدمت کے بجائے کاروباری اصول پر انجام دیتی ہے۔ فرم کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ پیداوار کا انتظام کرتی ہے۔ مزدوں کو روزگار دیتی ہے، کچّا مال اور مشین فراہم کرتی ہے اور ان سب کی مدد سے کسی خاص شے کی پیداوار کرتی ہے۔ وہ خرچ جو ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے مثلاً مزدوروں کی مزدوری، خام مال کی قیمت، مشینوں اور بلڈنگ کا کرایہ وغیرہ، پیداواری لاگت کہلاتا ہے۔ اس طرح پیداواری لاگت سے ہمارا مفہوم اس لاگت سے ہے جو متعلقہ چیز کے تیار کرنے پر آئی۔ فرم اس چیز کو ایسی قیمت پر فروخت کرنا پسند کرے گی جو عام طور پر پیداواری لاگت سے کافی زیادہ ہو، کل قیمت اور کل لاگت کے درمیان جو فرق ہوتا ہے وہ منافع کہلاتا ہے۔ یہ ہی فرم کی آمدنی ہے۔ جو اس کو عاملین پیداوار کی تنظیم کے سماجی طور پر مفید کام انجام دینے کے صلہ میں ملتا ہے۔ معاشیات میں ہم عام طور پر یہ مفروضہ قائم کرکے چلتے ہیں کہ ہر فرم بیش ترین منافع حاصل کرنا چاہتی ہے۔

معیشت کی تیسری بڑی اکائی صنعت ہے۔ایک صنعت کئی فرموں کا مجموعہ ہے جو کسی یکساں یا تقریباً یکساں شے کی پیداوار کرتی ہیں۔اس طرح سوتی کپڑے کی صنعت ان تمام فرموں کا مجموعہ ہے جو سوتی کپڑے کی پیداوار کرتی ہیں۔اور حسن افزا مصنوعات کی صنعت ان تمام فرموں کا مجموعہ ہے جو مختلف قسم کی حسن افزا اشیاء (لپ اسٹک، غازہ، پوڈر، کریم وغیرہ) تیار کرتی ہیں، صنعت کے تصور سے جڑا ہوا بازار کا تصور ہے۔ معاشیات میں بازار کا مفہوم عام مفہوم سے جدا ہے۔

عام بول چال کی زبان میں بازار کا مفہوم کسی ایک خاص جگہ سے ہوتا ہے جہاں چیزوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے جیسے کناٹ پیلس، چاندنی چوک، سبزی منڈی وغیرہ دہلی کے مختلف بازاروں کے نام ہیں۔ معاشیات میں بازار کا استعمال ایک اصطلاح کے طور پر کیا جاتا ہے۔ (۷) اور اس کے مخصوص معنی ہیں۔ بازار سے ہمارا مفہوم ایک ایسے علاقہ سے ہے جہاں کسی شے کے خریدنے والے اور بیچنے والے پھیلے ہوئے ہوں اور باہمی مسابقت اور بھاؤ تاؤ کے ذریعہ اس شے کی قیمت کا تعین کرتے ہوں۔اس طرح معاشیات کے نقطۂ نظر سے بازار کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہاں قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ عام طور پر ایک بازار میں ایک ہی قیمت رائج ہوتی ہے، کسی چیز کا بازار مقامی، علاقائی، قومی یا بین الاقوامی ہوسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف قسم کے پھلوں، ترکاریوں، دودھ اور دہی کا بازار مقامی بازار ہوتا ہے کیونکہ یہ اشیاء جلد برباد ہونے والی ہیں اور انھیں تیز رفتاری سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکا میں انھیں اشیاء کا بازار قومی بازار ہوتا ہے کیونکہ وہاں ان کو منجمد کیا جاسکتا ہے، تیزی سے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل کیا جاسکتا ہے اور پھر مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ دوکانوں میں فروخت کیا جاتا ہے، اس مثال سے ایک دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے میں آتی ہے کہ تکنیکی ترقی کے ذریعہ بازار کے حدود میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، ایسی اشیاء جو

ایک علاقے میں فروخت کی جاسکتی ہے لیکن دوسرے علاقے میں ان کی کوئی مانگ نہ ہو۔ علاقائی بازار رکھتی ہیں مثلاً کشمیر میں لوگ اپنا بدن گرم رکھنے کے ایک خاص قسم کی انگیٹھی کا استعمال کرتے ہیں، اس انگیٹھی کو کانگڑی کہتے ہیں، کانگڑی کا بازار خالص علاقائی ہے کیونکہ اس کی مانگ صرف وادئ کشمیر کی حدود میں ہے، ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اتنی سردی نہیں پڑتی کہ کانگڑی کی ضرورت پڑے۔ جن اشیاء کی خرید وفروخت کسی ملک کی قومی حدود میں ہی کی جاسکتی ہے ان کا بازار قومی بازار کہلاتا ہے، اس کی ایک عمدہ مثال حکومت ہند کی جاری کیے ہوئے سرکاری تمسکات ہیں جن کی خرید وفروخت سارے ہندوستان میں ہوتی ہے لیکن بیرون ہند، یہ سرکاری تمسکات قابل قبول نہیں ہیں۔ اسی طرح مختلف ملکوں کی قومی کرنسی کا بازار بھی قومی ہوتا ہے۔ (کرنسی بھی ایک شے ہے) روپیہ سارے ہندوستان میں چلتا ہے۔ پونڈ صرف انگلینڈ میں قابل قبول ہے۔ ڈالر سارے امریکا میں چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض اشیاء کا بازار بین الاقوامی ہوتا ہے۔ گیہوں، چاول، سونا، ادویات، فولاد، ہوائی جہاز، ٹینک اور ٹریکٹر وغیرہ ایسی اشیاء ہیں جن کا بازار بین الاقوامی ہوتا ہے کیونکہ قومی حدود کے باہر بھی ان کی خرید وفروخت ہوسکتی ہے۔

معیشت کی اگلی بڑی اکائی زمرہ ہے۔ زمرہ ایسی صنعتوں کا مجموعہ ہے جو ایسی اشیاء کی پیداوار کرتی ہوں جن میں کوئی مشترک خصوصیت پائی جاتی ہو، زمرہ کی تعریف اس پر منحصر ہے کہ کس مقصد کے تحت کسی اکائی کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا جارہا ہے۔ مثلاً صارفین کے استعمال میں آنے والی اشیاء کی پیداوار کرنے والا زمرہ، اشیائے صرف کا زمرہ کہا جاسکتا ہے۔ اس بنیاد پر کہ صنعتوں کی ملکیت کا کیا نظام رائج ہے صنعتوں کو نجی زمرہ اور عوامی زمرہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ تمام صنعتیں جو برآمد کے لئے پیداوار کرتی ہیں برآمدی زمرہ میں شامل کی جاسکتی ہیں، جن صنعتوں میں درآمد شدہ کچا مال یا مشینیں استعمال ہوتی ہیں درآمدی زمرہ کا حصہ بنائی جاسکتی ہیں، وہ تمام فرمیں، جو درآمد اور برآمد کا کاروبار کرتی ہیں غیر ملکی تجارت کا زمرہ کہی جاسکتی ہیں۔

اس طرح ایک معیشت کو مختلف بنیادوں پر مختلف زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

فی الحقیقت ہم جس اصول کا استعمال کرتے آئے ہیں اسے ماہرین معاشیات اصول تجمیع (Aggregation Procedure) سے تعبیر کرتے ہیں، صنعت فرموں کا مجموعہ ہے۔ اور زمرہ صنعتوں کا مجموعہ، اسی طرح معیشت مختلف زمروں کا مجموعہ ہے۔ معیشت کی مختلف اکائیوں کے درمیان تعلق کو شکل نمبر-1 میں واضح کیا گیا ہے۔

شکل نمبر-1: معیشت کے مختلف رخ

(ب) پیداوار کے نقطۂ نظر سے
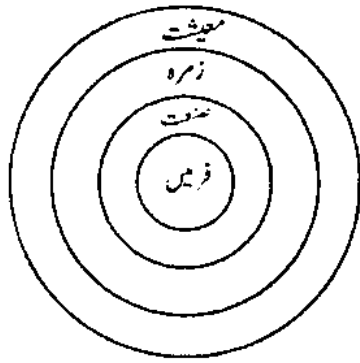
(الف) صرف کے نقطۂ نظر سے
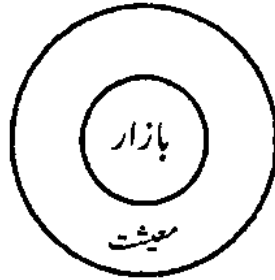
(ج) تبادلہ کے نقطۂ نظر سے
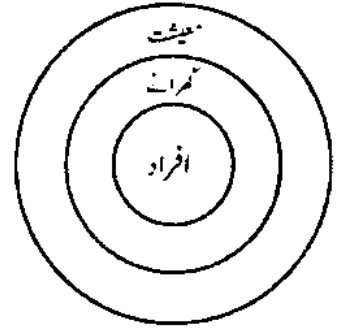
شکل (الف) صرف کے نقطۂ نظر سے معیشت کی بناوٹ کو واضح کرتی ہے کہ معیشت مختلف گھرانوں سے مل کر بنتی ہے اور گھرانے افراد سے مل کر بنتے ہیں، شکل کا جز (ب) پیداوار کے نقطۂ نظر سے معیشت کا جائزہ ہے۔ معیشت مختلف زمروں سے مل کر بنتی ہے، زمرے صنعتوں کا مجموعہ ہیں، اور صنعتیں فرموں کا مجموعہ ہیں۔ شکل کا جز (ج) تبادلہ کے رخ سے معیشت کا جائزہ ہے کہ معیشت مختلف قسم کے بازاروں کا مجموعہ ہے، مثلاً اشیائے صرف کا بازار، محنت کا بازار، سرمایہ کا بازار وغیرہ۔

علم معاشیات کی مختلف شاخیں

علم معاشیات کو دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1-نظری معاشیات (Theoretical Economics)

2-اطلاقی معاشیات (Applied Economics)

اطلاقی معاشیات کی ماہیت، اس کی حدود اور دائرہ مطالعہ نیز نظری معاشیات سے اس کے تعلق کو سمجھنے کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ہم نظری معاشیات کی ماہیت، اور اس کی حدود نیز استعمال سے واقفیت حاصل کریں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کو نظریہ سازی کے عمل، کے مختلف پہلوؤں اور اس کی افادیت کا بھی احساس ہو۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ معاشیات ایک طرح سے اس بات کا مطالعہ ہے کہ معیشت کس طرح سے کام کرتی ہے۔ معیشت کا مطالعہ مختلف سطحوں پر کیا جاسکتا ہے، نظری معاشیات کو، اس سطح کے مطابق، جس پر وہ معاشی اعمال کی تفتیش کرتی ہے، مندرجہ ذیل دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

١- معاشیاتِ جزئیاتی (Micro Economics)

٢- معاشیاتِ کُلّی (Macro Economics)

نظری معاشیات کی وہ شاخ جو معیشت کا مطالعہ جزئیاتی سطح پر کرتی ہے معاشیات جزئیاتی کہلاتی ہے۔ اس کا انگریزی مرادف (Micro) یونانی زبان سے مستعار ہے جس کے معنی ہیں چھوٹا یا مختصر، اس لئے معاشیاتِ جزئیاتی، معیشت کے چھوٹے چھوٹے حصوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتی ہے، معاشیات کلی کا انگریزی مرادف یونانی زبان کے لفظ (Macro) سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بڑا یا ضخیم۔ لہٰذا کلی معاشیات میں ہمارا موضوع معیشت کے اجتماعی تغیرے (Aggregate Variables) ہوتے ہیں جیسے قومی آمدنی، قیمتوں کی سطح، اور روزگار کی سطح وغیرہ، اس کا تعلق اس قسم کے مسائل سے ہے جیسے: کسی معیشت میں آمدنی کی سطح کا تعین کیسے ہوتا

ہے؟ اس میں اتار چڑھاؤ کیوں ہوتے ہیں؟ ایسا کیوں کر ہوتا ہے کہ تمام اشیاء کی قیمتیں بعض اوقات میں بڑھتی رہتی ہیں اور بعض دوسرے اوقات میں گھٹتی رہتی ہیں؟ صنعتوں اور معیشت میں زائد صلاحیت (Excess Capacity) کیوں اور کیسے پیدا ہو جاتی ہے؟ ان تمام مسئلوں کے تجزیہ کی بنیادی اکائی پوری معیشت ہے۔ اس کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔

دوسری جانب ہمارے سامنے ایک دوسری نوعیت کے معاشی مسائل بھی آتے ہیں جیسے: کسی فرد کو اپنی آمدنی کیسے صرف کرنا چاہیے؟ وہ اپنے قلیل وسائل کو مختلف النوع اور متبادل ضروریات کی تسکین کے لئے کس بہترین طریقے سے تقسیم کرے؟ کسی جنس کی انفرادی مانگ کو بازار مانگ میں کس طرح تبدیل کیا جاتا ہے؟ کسی جنس کی قیمت کا تعین بازار کی مختلف حالتوں میں کیسے ہوتا ہے؟ کوئی فرم یہ فیصلے کیسے کرتی ہے کہ کس شے کی پیداوار کرے، کتنی مقدار میں کرے، اور پیداوار کی کس تکنیک کو استعمال کرے؟ کسی صنعت میں مسابقت کا ہونا بہتر ہے یا اجارہ داری کا؟ ان تمام مختلف النوع مسائل میں صرف ایک عنصر مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان سب کا تعلق کسی ایک فرد، کسی ایک فرم، یا کسی ایک بازار کے معاشی اعمال اور معاشی فیصلوں سے ہے۔ اس لئے ان کا مطالعہ جزئیاتی معاشیات میں کیا جاتا ہے۔

نظری معاشیات کی جزئیاتی اور کلی معاشیات میں تقسیم کو سخت اور مصنوعی تقسیم گردانا درست نہیں ہے۔ ان میں بہت کچھ مشترک ہے۔ اور دونوں شاخیں کئی طرح سے ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ درحقیقت معاشیات کی جزئیاتی اور کلی معاشیات میں تقسیم اس بات کا اعتراف ہے کہ انسانوں کا اجتماعی برتاؤ ہمیشہ ان کے انفرادی برتاؤ جیسا نہیں ہوتا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تجزیاتی مقاصد کی خاطر انھیں ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اجتماعی برتاؤ انفرادی برتاؤ سے ہمیشہ مختلف ہوگا۔ بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ انفرادی برتاؤ کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ اجتماعی برتاؤ کے بارے میں بھی سچ ہوتی ہیں۔ لیکن اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ چند جدید ماہرین معاشیات جن میں گیری بیکر سب سے نمایاں ہیں، کلی اور

جزئیات معاشیات کی اس تفریق کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں،ان کے خیال میں کلی اور جزئیاتی مسائل کا تجزیہ کرنے کے لئے الگ الگ نظریہ سازی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ نظری معاشیات جو کلی اور جزئیاتی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہو، ہر قسم کے معاشی مسائل کے تجزیہ سے عہدہ برآ ہوسکتی ہے۔ (۸) تاہم بعض وجوہات کی بنا پر ہم اس تفریق کو برقرار رکھیں گے۔ دوم: کلی اور جزئیاتی معاشیات کی تفریق معاشی تجزیہ میں ایک محترم روایت کی صورت اختیار کر چکی ہے اور جب تک اس روایت سے بغاوت کے لئے مناسب وجوہات اور کافی فائدہ کی امید نہ ہو، ایسا کرنا بے سود ہوگا۔ سوم: یونیورسٹیوں میں معاشیات کے نصاب عام طور پر کلی اور جزئیاتی معاشیات کے درمیان منقسم رہتے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلی اور جزئیاتی مسائل کے درمیان امتیاز کو قائم رکھا جائے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس جگہ کلی اور جزئیاتی معاشیات کی اضافی اہمیت کے بارے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ کردیا جائے جو کہ معاشیات کے طالب علموں میں اکثر صرف اس لئے پیدا ہوجاتی ہیں کہ درسی کتابوں میں مصنفین یا تدریس کے دوران مدرسین ان باتوں کو بدیہی یا بعض حالتوں میں غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کلی معاشیات جزئیاتی معاشیات سے زیادہ مفید، زیادہ موزوں، یا زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دونوں یکساں طور پر مفید یا غیر مفید ہیں۔ موقع و محل کے اعتبار سے دونوں یکساں طور پر موزوں یا ناموزوں ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح دونوں یکساں طور پر حقیقت پسندانہ یا غیر حقیقت پسند ہوسکتی ہیں۔ اس قسم کے اعتراضات اگر معاشیات کی کسی ایک شاخ کے خلاف عائد کیے جائیں تو وہ دوسری شاخوں پر بھی اسی طرح وارد ہوتے ہیں کیونکہ ان کی نظری نوعیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور فی الواقع دونوں شاخیں تقریباً یکساں طریقہ تحقیق اپناتی ہیں جس کی مختصر وضاحت ذیل میں کی جائے گی۔

سچ تو یہ ہے کہ کلی اور جزئیاتی معاشیات معاشی عمل کے مطالعہ اور تجزیہ کے لئے دو مختلف اندازِ نظر ہیں۔ کسی وقت ایک بامعنی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے جزئیاتی طریقہ اپنانے کی

ضرورت ہوتی ہے، بعض دوسرے مسائل حل کرنے کے لئے یہ طریقہ ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ اُس وقت کلی طریقۂ تجزیہ کام آتا ہے، اِس سے یہ نتیجہ کہیں سے نہیں نکلتا ایک طریقۂ تحقیق نے دوسرے کو باطل کردیا ہے اور وہ غیر ضروری، غیر متعلق، یا غیر مفید ہوگیا ہے، اس قسم کی غلط فہمیاں وہ تحفظات ذہنی پیدا کردیتی ہیں جو اس سائنسی اندازِ فکر کے منافی ہے جو بالآخر ایک علم کے حیثیت سے معاشیات کا مطمح نظر ہے۔

نظری معاشیات کی ماہیت

کلی اور جزیاتی معاشیات، دونوں نظری معاشیات کی قسمیں ہیں، اطلاقی معاشیات کی جداگانہ حیثیت، اور نظری معاشیات سے اس کے رشتہ کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم آگے بڑھنے سے قبل نظریہ کی ماہیت کو واضح کردیں۔ نظریہ کیا ہے؟ نظریاتی طریقہ کیا ہے؟ اس کے کیا مضمرات اور حدود ہیں؟ کسی نظریہ کو کس وقت رد کیا جاسکتا ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب پانا ضروری ہے تاکہ ہم نظریہ کی اہمیت کو جان سکیں اور اس کا صحیح استعمال سیکھ سکیں۔ اس ضمن میں اس سے بہتر کچھ نہ ہوگا اگر ہم لفظ نظریہ کے معنی کسی اچھی لغت میں تلاش کریں، (Webster's Seventh New Collegiate Dictionary). میں نظریہ (Theory) کے مندرجہ ذیل معنی بتائے گئے ہیں:

> ''نظریہ: (1) ایک دوسرے سے رشتہ کے طور پر حقائق کے کسی مجموعہ کا تجزیہ (2) کسی سائنس یا کسی فن سے متعلق حقائق کے عام یا مجرد اصول (3) کسی عمل کی وضاحت کرنے والے ممکنہ، یا سائنسی طور پر قابل قبول عام اصول یا اصولوں کا مجموعہ (4) ایک مفروضہ جسے کسی دلیل یا تفتیش کے لئے فرض کرلیا گیا ہو۔ (5) مجرد خیال''۔ (۹)

نظریہ کے لغوی معنی سے بھی اس کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔(الف) نظریہ ایک عام بیان ہے۔(ب) یہ حقیقی دنیا کی تجرید ہے (ج) یہ حقیقی دنیا کے کسی مظہر کا تجزیہ کرتا ہے (د) یہ سائنسی طریقہ استعمال کرتا ہے (ہ) اس کے ذریعہ حقیقی دنیا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

امور بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نظریہ کی مندرجہ ذیل تعریف بیان کر سکتے ہیں:

''نظریہ ایک ایسا عام بیان ہے جو حقیقی دنیا کی تجرید ہے، اور حقیقی دنیا کے کسی مظہر سے تعلق رکھنے والے مختلف حقائق کی، ایک دوسرے سے رشتہ کے طور پر تشریح یا تجزیہ کرتا ہے۔''(۱۰)

چونکہ نظریہ بالذات مجرد ہے اس لئے کسی نظریہ پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ وہ مجرد یا غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ اصلی دنیا مختلف قسم کے حقائق اور واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اگر ہم تمام ضروری اور غیر ضروری، اہم اور غیر اہم، متعلق اور غیر متعلق حقائق کو ایک جگہ جمع کر دیں تو ہمیں کسی بھی چیز کے بارے میں چنداں علم حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ ہم حقائق کے اس گھنے اور پر خطر جنگل میں اپنی راہ گنوا بیٹھیں گے اور ہمیشہ اسی جنگل میں بھٹکتے رہیں گے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اہم، ضروری، اور مفید معلومات کو غیر اہم، غیر ضروری اور غیر مفید معلومات سے علیحدہ کریں، کسی خاص نظریاتی تفتیش کے لئے متعلق اور مفید معلومات یا حقائق کا مجموعہ کون سا ہے یہ بہت کچھ اس تفتیش کی نوعیت اور نظریہ ساز (Theoretician) کے وجدان پر منحصر ہے۔ متعلق حقائق کے انتخاب کے لئے کوئی اصول متعین نہیں کیے جاسکتے۔ اس کے لئے نظریہ ساز اپنی قوت فیصلہ اور وجدان کا استعمال کرتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظریاتی تفتیش کے ابتدائی مراحل میں ہی کچھ داخلی اور غیر معروضی عناصر اس میں شامل ہو جاتے ہیں، خصوصاً سماجی علوم کے نظریات میں داخلیت کا کافی امکان ہے کیونکہ ایک نظریہ ساز کا وجدان اور فیصلہ دوسرے سے

قطعی مختلف ہوسکتا ہے، اس صورت میں کسی نظریہ کو، محض ان معلومات کی بناء پر بھی چیلنج کیا جاسکتا ہے جن کو متعلق اور مفید سمجھ کر نظریہ سازی کی گئی ہے۔ ایسی صورت میں ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو کسی ایک مخصوص نظریہ کے بارے میں یہ اعتراض ہے کہ اس نظریہ میں تمام متعلقہ حقائق کو پیش نظر نہیں رکھا گیا تو وہ اس کے لئے مکمل طور پر آزاد ہے کہ حقائق کا کوئی دوسرا مجموعہ جو اس کے خیال میں زیادہ متعلق اور موزوں ہو، پیش نظر رکھ کر کوئی دوسرا نظریہ پیش کرے۔

نظریاتی تفتیش کا بنیادی نقطہ اصلی دنیا ہے جس میں ہم زندہ رہتے ہیں نظریاتی اور تجرباتی تفتیش میں پیش آنے والے مختلف مراحل کی نشان دہی شکل نمبر-2 میں کی گئی ہے۔
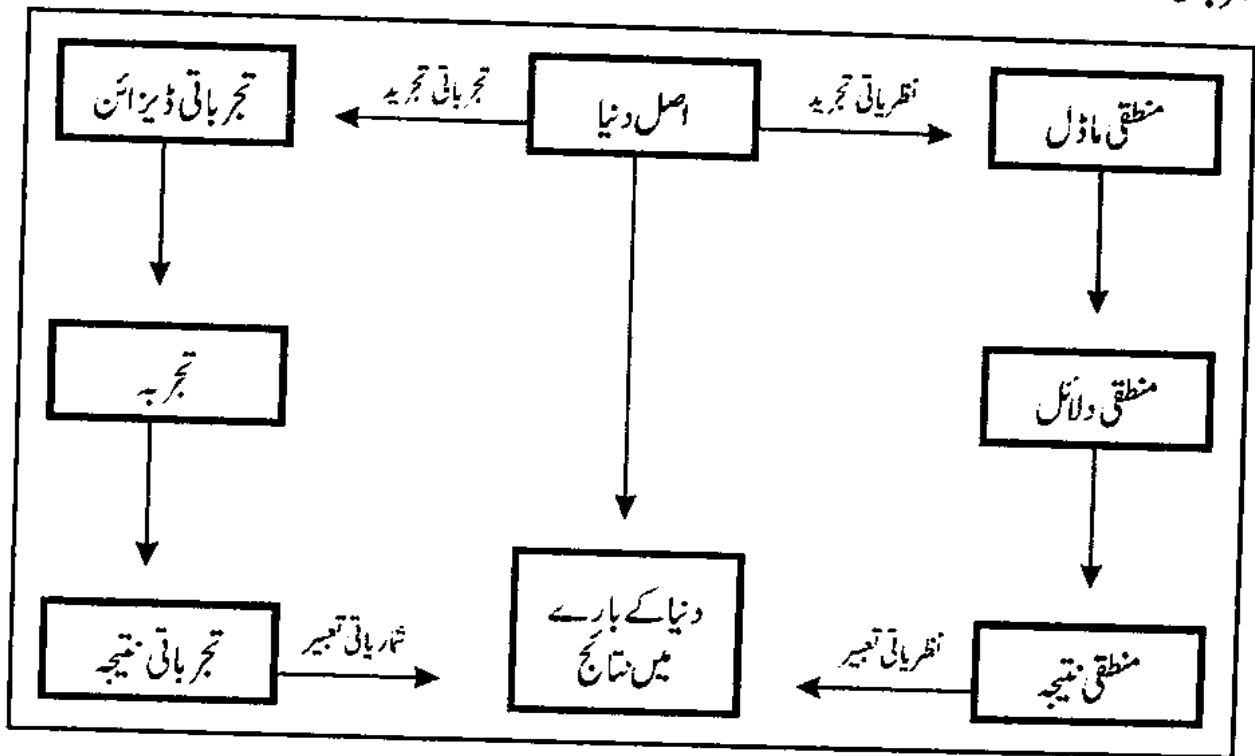
سب سے پہلے تو ہم اصل دنیا کا براہِ راست مشاہدہ کر کے کچھ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح حاصل کیا گیا علم سائنسی نہیں کہلایا جاسکتا کیونکہ اس میں کسی علمی طریقۂ تفتیش کا استعمال نہیں کیا گیا۔ اس میں ہمارے اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات اور جذبات کو دخل ہوسکتا ہے، ہمارے تعصّبات اور ذہنی تحفظات نتائج کو مسخ کر سکتے ہیں۔ یہ علم معروضی نہیں ہوگا۔ سائنسی طریقۂ تفتیش میں ہمارے جذبات، تعصّبات اور خواہشات کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے، براہِ

راست مشاہدے کے ذریعہ حاصل کئے گئے علم کی افادیت مشاہدہ کرنے والے کی ذاتی بصیرت اور وجدان کی مرہون منت ہے۔ اس کا تجربہ یا مشاہدہ بالکل ذاتی ہے، اس کے نتائج کی پرکھ کرنے کے لئے کوئی معروضی بنیاد اور معیار مہیا نہیں ہیں۔

اس کے برعکس نظریاتی طریقۂ تفتیش ہمیں سائنسی اور یقینی علم عطا کرتا ہے کیونکہ یہ ایک سائنسی طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ شکل نمبر-2 میں داہنی طرف نظریاتی تفتیش میں پیش آنے والے مراحل دکھلائے گئے ہیں، اصلی دنیا کے مظاہر کا مشاہدہ کرنے کے بعد نظریہ ساز نظریاتی تجرید کا استعمال کرتے ہوئے ایک منطقی ماڈل کی تشکیل کرتا ہے۔ منطقی ماڈل، فی الحقیقت بیانات اور دعوؤں کے مجموعہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ معاشیات کے تمام نظریات فی الحقیقت منطقی ماڈل ہیں چاہے ان کو قدیم رنگ میں صرف زبان کے وسیلہ سے ظاہر کیا جائے یا جدید فیشن کے مطابق ریاضیاتی علامتوں کے ذریعہ مدون کیا جائے۔ بیانات اور دعاوی کی بنیاد پر کچھ منطقی دلائل دیئے جاتے ہیں، اور ان دلائل سے کوئی عام نتیجہ یا نتائج اخذ کئے جاتے ہیں، یہی نظریاتی طریقۂ تفتیش ہے اور نظری معاشیات میں اسی طریقہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

شکل نمبر-2 کے بائیں جانب تجرباتی تفتیش میں پیش آنے والے مراحل ظاہر کئے گئے ہیں سب سے پہلے تو محقق اصلی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس میں سے زیر تحقیق مسئلہ سے متعلق حقائق جمع کرتا ہے، اس مرحلہ کو تجرباتی تجرید کہتے ہیں، یہ اس لئے ضروری ہے کہ محقق اپنی تجربہ گاہ میں اصل دنیا کی صورت حال کو بجنسہ پیدا نہیں کرسکتا۔ تاہم پھر بھی وہ تجربہ گاہ میں وہ ایک ایسی صورت حال پیدا کرنا چاہے گا جو ممکنہ حد تک اصل دنیا کی صورت حال سے ملتی جلتی ہو، یہیں سے تجرید کا دخل شروع ہوجاتا ہے، اس کے بعد محقق ایک تجرباتی ڈیزائن تیار کرتا ہے اور اس کے مطابق تجربہ کرتا ہے، تجربہ کے نتائج کچھ اعداد وشمار (یا مشاہدات) کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ محقق ان کا تجزیہ کرتا ہے، اس تجربہ کے ذریعہ محقق جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ ہمیں اصل دنیا کو

سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ دنیاوی حقائق کی شماریاتی یا احتمالی تعبیر ہے۔ یہ طریقہ تفتیش عام طور پر قدرتی علوم میں اپنایا جاتا ہے، چونکہ سماجی علوم اور معاشیات میں تجربہ گاہ کی صورت حال کا پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے اس طریقہ تفتیش کا استعمال صرف محدود پیمانہ پر ہی ممکن ہے۔

ہم اس بات کا اوپر تذکرہ کر چکے ہیں کہ نظری معاشیات میں منطقی دلائل کا استعمال کیا جاتا ہے، منطقی دلائل دو قسم کے ہوتے ہیں: (1) استقرائی یا قیاسی (Inductive) (2) استخراجی یا استنباطی (Deductive) استقرائی دلائل میں ہم جزو سے کل کی طرف مراجعت کرتے ہیں، اس قسم کے دلائل عام طور پر تجرباتی علوم میں استعمال کئے جاتے ہیں، بعض علماء فلاسفہ مثلاً ڈیوڈ ہیوم کا خیال ہے کہ استقرائی دلائل مکمل طور پر جائز نہیں ہیں کیونکہ ان کی بنیاد فطرت کے قانون یکسانیت (Law of Uniformitiy of Nature) پر ہے جو خود ثابت شدہ نہیں ہے، دوسری طرف استخراجی دلائل کو منطقی طور پر صحیح اور جائز متصور کیا جاتا ہے، اور شائد یہی وجہ ہے کہ علم منطق اور ریاضیاتی علوم میں استخراجی دلائل کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے، نظریاتی معیشت میں بھی اسی طریقہ تفتیش کا استعمال کیا جاتا ہے اور غالباً یہ استخراجی دلائل ہی ہیں جن کے استعمال کے باعث بعض ماہرین معاشیات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''...... علم معاشیات استخراجی حقائق کا ایک نظام ہے۔ یہ عقلِ محض (Pure Reason) کی پیداوار ہے...... مختلف قسم کے دعاوی سے خالص استخراج کا نظام ہے''۔ (11)

استخراجی دلائل میں بعض بیانات اور دعاوی کی بنیاد پر کچھ نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ اگر یہ بیانات اور دعاوی صحیح ہیں اور ان سے اخذ کیا گیا نتیجہ بھی صحیح ہونا چاہیے بشرطیکہ دلیل دینے میں کسی منطقی غلطی کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو۔ استخراجی دلائل کی ایک عمدہ مثال قیاس منطقی (Syllogism) ہے جس میں ایک بیان کبریٰ (General Premise) اور دوسرا صغریٰ (Minor Premise) ہوتا ہے۔ مثلاً:

تمام انسان فانی ہیں	کبریٰ
زید ایک انسان ہے	صغریٰ
زید فانی ہے	نتیجہ

یہ دلیل ایک عام بیان (کبریٰ) سے شروع کی گئی ہے کہ تمام انسان فانی ہیں، پھر ہم یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ زید انسان ہے۔ ان دونوں دعاوی کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ زید فانی ہے یہ نتیجہ صرف اسی صورت میں غلط ہوسکتا ہے کہ صغریٰ اور کبریٰ میں سے کم سے کم ایک یا دونوں بیانات غلط ہوں۔ بدیہی طور پر یہ ظاہر ہے کہ کبریٰ درست ہے، اور صغریٰ بھی درست ہے، اس لئے نتیجہ بھی لازماً درست ہونا چاہیے۔ آیئے اب ایک دوسری مثال لیں:

تمام انسان احمق ہیں	کبریٰ
زید ایک انسان ہے	صغریٰ
زید احمق ہے	نتیجہ

اس مثال میں ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ نتیجہ درست ہے، کیونکہ ہم نے ایک ایسے بیان سے اپنی دلیل شروع کی ہے جو صریحاً صحیح نہیں ہے، اس لئے نتیجہ بھی صحیح نہیں ہوسکتا، ہوسکتا ہے کہ زید احمق ہو۔ ہوسکتا ہے کہ نہ ہو۔ اگر زید واقعتاً احمق ہے تو بھی یہ دلیل درست نہیں ہے کیونکہ زید کے احمق ہونے سے تمام انسانوں کا احمق ہونا لازم نہیں آتا۔

نظری معاشیات میں جن استخراجی دلائل کا استعمال کیا جاتا ہے وہ اتنے زیادہ آسان نہیں ہوتے جتنی آسان اوپر دی گئی مثالیں ہیں، معاشیات میں کہیں زیادہ پیچیدہ دلائل سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہاں پر صرف اس طریقہ استدلال کو واضح کرنا مقصود تھا۔

معاشی نظام: اقسام، وظائف اور ماہیت

یہ تو معروف ہے کہ معیشت ایک سماجی تنظیم ہے جس کے ذریعہ کوئی سماج اپنے معاشی اعمال انجام دیتا ہے۔ یہ معاشی اعمال کسی ملک کے سماجی اور آئینی قوانین کے حدود کے اندر رہ کر ہی انجام پذیر ہوتے ہیں۔ سماجی قوانین سے مراد ان رسم و رواج، اور ان معمولات سے ہے جن کو سماج کی پشت پناہی حاصل ہے۔ مثلاً یہ ایک سماجی قانون ہے کہ آپ جھوٹ نہ بولیں اور وعدہ خلافی نہ کریں۔ اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے یا وعدہ خلافی کرتا ہے تو ایک سماجی جرم کا ارتکاب کرتا ہے لیکن یہ جرم قابل تعذیر نہیں ہے یعنی اس کے خلاف کسی قسم کی قانونی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن بعض قوانین ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو سماج کے ساتھ ساتھ آئین کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے قوانین، آئینی قوانین کہلاتے ہیں مثلاً چوری کرنا صرف ایک سماجی جرم نہیں ایک قانونی جرم ہے اور ایسے شخص کو جس نے چوری کا ارتکاب کیا ہو قانوناً سزا دی جاسکتی ہے۔

معاشی نظام سے ہماری مراد سماجی اور قانونی اداروں (Social and Legal Institutions) کے اس مجموعہ سے ہے جن کے اندر رہ کر معیشت کام کرتی ہے۔ معاشیات میں ہم صرف ان قانونی یا سماجی معاشی اعمال سے بحث کرتے ہیں جن کو قانون اور سماج تسلیم کرتا ہے۔ لیکن ہر ملک میں سماجی اور قانونی ادارے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے ان اداروں کے درمیان فرق کی بنیاد پر مختلف قسم کے معاشی نظاموں میں بھی تفریق کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ ہم مختلف قسم کے معاشی نظاموں کا تذکرہ کریں، ان کی تعریف مقرر کریں، ان کی ماہیت کا تجزیہ کریں اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لیں، مناسب یہ ہوگا کہ ہم ایک عام معیار کا تعین کریں جن

کی بنیاد پر مختلف معاشی نظاموں کا موازنہ ممکن ہو۔
پروفیسر سیموئیلسن نے کسی معاشی نظام کی کارکردگی کا مطالعہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تین عام معیار مقرر کیے ہیں۔

۱- کن چیزوں کی پیداوار کی جائے؟

ہر معاشی نظام کو اس بات کا کسی نہ کسی طرح فیصلہ کرنا ہوگا کہ پیداوار کن چیزوں کی کی جائے اور کتنی مقدار میں ہر چیز کی پیداوار کی جائے، اس مسئلہ کا سبب یہ ہے کہ پیداواری وسائل محدود ہیں اور سماج کو جن اشیاء اور خدمات کی ضرورت ہوتی ہے وہ بے شمار ہیں، اس لئے سماج کو کسی نہ کسی طرح یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کن اشیاء کی پیداوار پر وسائل صرف کرے اور کن چیزوں کی پیداوار نہ کرے۔ چونکہ پیداواری وسائل کو مختلف تناسبوں میں لگایا جا سکتا ہے اس لئے انتخاب کے لامحدود امکانات مہیا ہیں۔ لیکن کل پیداوار جو واقعتاً کی جائے گی اب بھی محدود ہی رہے گی۔
اس مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ ہماری معیشت میں مکمل روزگار (Full Emplyment) کی کیفیت پائی جاتی ہے یعنی بے روزگاری عام نہیں ہے۔ اور کسی قسم کے وسائل بھی بے کار نہیں ہیں۔ صنعتوں میں زائد صلاحیت نہیں ہے اور تمام وسائل پوری طرح استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک چیز کی پیداوار میں اضافہ صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ کسی دوسری چیز کی پیداوار گھٹا دی جائے۔ فرض کیجئے کہ کسی معیشت میں اس قدر وسائل مہیا ہیں کہ وہ 50 ہزار کلوگرام مکھن کی روزانہ پیداوار کی جا سکتی ہے لیکن اگر یہ پیداوار کی جائے تو بندوق کی پیداوار کے لئے کچھ بھی وسائل باقی نہیں رہیں گے۔ دوسری جانب اگر مکھن کی پیداوار نہ کی جائے اور صرف بندوقیں پیدا کی جائیں تو دس ہزار بندوقوں کی روزانہ پیداوار ممکن ہے، اس طرح معیشت کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ چاہے وہ 50 ہزار کلوگرام مکھن کی پیداوار کرے

یا 10 ہزار بندوقوں کی پیداوار کرے۔ اس طرح 50 ہزار کلوگرام مکھن کی لاگت وہ 10 ہزار بندوقیں ہیں جو پیدا کی جاسکتی تھیں لیکن پیدا نہیں کی گئیں۔ معاشیات میں اس قسم کی لاگت کو متبادل لاگت (Opportunity Cost) کہتے ہیں۔

شکل نمبر 1: پیداوار کا خطِ امکان
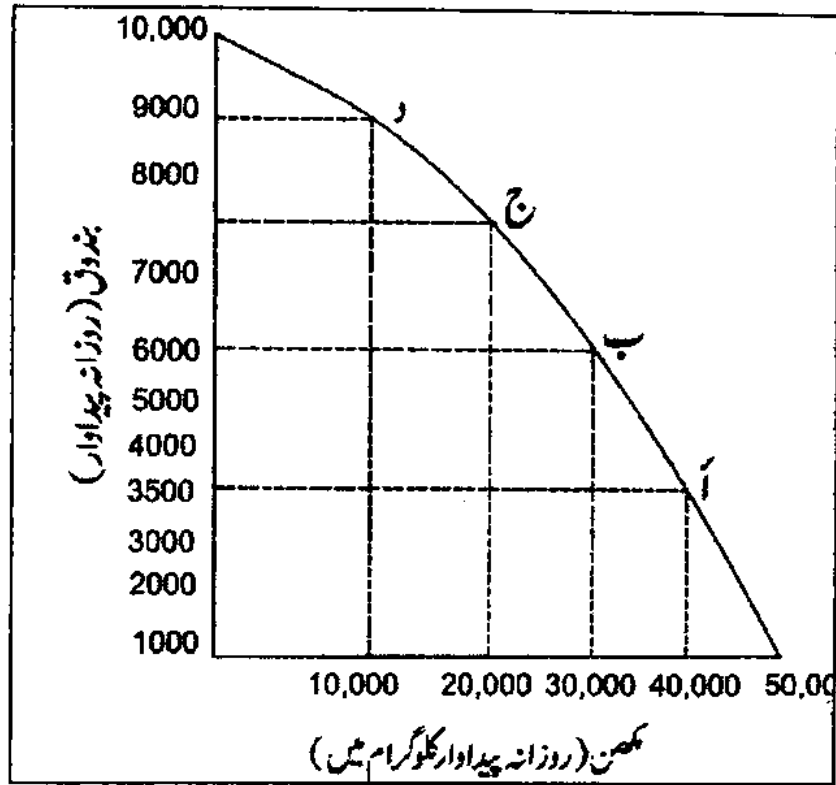
عام طور پر معیشت کے سامنے انتخاب کے جو مسئلے ہوتے ہیں وہ اتنے آسان نہیں ہوتے۔ ایسے مسئلہ کی نوعیت کی وضاحت شکل-1 کی مدد سے کی جاسکتی ہے، اس شکل میں عمودی سطح پر مکھن کی روزانہ پیداوار کلوگرام میں اور افقی سطح پر بندوقوں کی روزانہ پیداوار تعداد میں دکھائی گئی ہے۔ چونکہ معیشت کے لئے یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ صرف مکھن یا صرف بندوقیں پیدا کی جائیں اور دوسری چیز کی پیداوار بالکل نہ کی جائے اس لئے معیشت کی پیداوار الف، ب، ج، اور د، میں سے کسی ایک نقطہ پر ہوگی جو یہ بالترتیب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مکھن اور بندوقوں کی کتنی مقدار

کی پیداوار کی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر نقطہ ''ب'' پر تیس ہزار کلوگرام مکھن کی پیداوار روزانہ کی جاتی ہے اور چھ ہزار بندوقیں پیدا کی جاتی ہیں، اب اگر مکھن کی پیداوار میں اضافہ مقصود ہے اور اس کی پیداوار 30 ہزار کلوگرام سے بڑھا کر 40 ہزار کلوگرام کردی جائے تو اس کے لئے وسائل کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ بندوقوں کی صنعت سے سرمایہ اور محنت کو نکالنا ہوگا تا کہ مزید مقدار میں مکھن فراہم کیا جاسکے۔ اس کے نتیجہ میں بندوقوں کی پیداوار گھٹ جائے گی۔ شکل-1 میں دیئے گئے اعداد وشمار کے مطابق مکھن کی پیداوار میں 15 ہزار کلوگرام کے اضافہ کے لئے 2500 بندوقوں کی قربانی دینا ہوگی، اگر ہم الف، ب، ج، اور د، نقطوں کو آپس میں ملادیں تو اس طرح جو خط وجود میں آئے گا وہ پیداوار کا خطِ امکان (Production Possiblity Curve) کہلاتا ہے، پیداوار کا خطِ امکان اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ دو چیزوں کے درمیان معیشت کی پیداوار صلاحیت کتنی ہے اور ایک چیز میں ایک اکائی کے اضافہ کے لئے دوسری چیز کی کتنی اکائیوں سے درگذر کرنا ہوگا۔ خطِ امکان کی اونچائی معیشت کی ترقی کی سطح اور تکنیکی ترقی پر منحصر ہے، اس طرح ایک غیر ترقی یافتہ معیشت میں پیداوار کا خطِ امکان، ایک ترقی یافتہ معیشت بہ نسبت کم اونچا ہوگا۔

۲- پیداوار کس طرح کی جائے؟

کسی معیشت کو ایک بار یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ فلاں فلاں چیزوں کی پیداوار کی جائے، دوسرا مسئلہ یہ درپیش ہوگا کہ ان کی پیداوار کس طریقے سے کی جائے، یہ مسئلہ پیداوار کی تکنیک کے انتخاب کا مسئلہ ہے اور ہر معاشی نظام کو کسی نہ کسی طرح اس مسئلہ پر فیصلہ سازی کا کوئی طریقہ وضع کرنا ہوگا۔ اصولاً ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جیسے سڑکوں کے کنارے بجلی کے کھمبے لگانا۔ یہ بجلی کے کھمبے لکڑی سے بھی بنائے جاسکتے ہیں، سیمنٹ سے بھی، اور لوہے سے بھی، اگر معیشت میں لوہا کمیاب ہے تو یہ زیادہ مفید ہوگا کہ بجلی کے کھمبے لکڑی یا

سیمنٹ سے بنائے جائیں اور اس طرح جو لوہا کھمبوں کے بنانے میں کام آتا اس کی بچت ہو جائے گی اور اس بچے ہوئے لوہے کو سیمنٹ بنانے کے کارخانے میں یا لکڑی چیرنے کے کارخانوں میں مشینری بنانے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یا ایک دوسری مثال لیجئے، کپڑے کی پیداوار کے لئے مختلف طرح کی پیداواری تکنیک فراہم ہیں۔ کپڑا ہتھ کرگھوں اور (Power Loom) سے بنایا جاسکتا ہے یا اس کے بجائے کپڑا ملوں میں بھی اس کی پیداوار کی جاسکتی ہے جہاں اعلیٰ درجہ کی ٹکسٹائل مشینوں کی ضرورت ہوگی۔ اب ان میں سے فی الواقع کس طریقے کا انتخاب کیا جائے؟ اور اس فیصلہ سازی کی صورت کیا ہو؟

۳- پیداوار کس کے لئے کی جائے؟

کسی معاشی نظام کو یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ جن چیزوں کی پیداوار کی جائے گی وہ بالآخر کن لوگوں کے استعمال میں آئے گی، یعنی معیشت کے مختلف لوگوں، گروہوں اور طبقوں میں اس کو کس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ یہ مسئلہ اس بات سے تعلق رکھتا ہے کہ پیداواری وسائل کے مالکان کو ان کی خدمات کا معاوضہ کس طرح ملے گا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ سماج میں رہنے والے لوگوں کا رول دوہرا ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ لوگ صارفین ہیں جو اشیائے صرف کا استعمال کرتے ہیں، لیکن یہی لوگ کسی نہ کسی ذریعۂ پیداوار کے مالک بھی ہیں۔ یا تو وہ محنت کے مالک محنت کش ہیں اور مزدوری کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتے ہیں، یا پھر سرمایہ کے مالک ہیں اور سود حاصل کرتے ہیں، یا زمین کے مالک ہیں اور لگان حاصل کرتے ہیں، یہی ان لوگوں کی آمدنی ہے جس کو یہ لوگ دوبارہ اِن چیزوں کے خریدنے پر صرف کرتے ہیں جن کی اُن کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کسی سماج کی کل پیداوار ان لوگوں کے درمیان تقسیم ہو جاتی ہے جنھوں نے اپنے پیداواری وسائل کے توسط سے اس دولت (اشیاء اور خدمات) کی پیدائش میں

حصہ لیا، یہ مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا مسئلہ ہے، اور ہر معاشی نظام کو اس مسئلہ کے حل کے لئے بھی فیصلہ سازی کا طریقہ متعین کرنا ہوگا۔

مندرجہ بالا تین بنیادی مسائل کے علاوہ جارج ہام نے معاشی نظاموں کے کارکردگی کے مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل مسائل کا بھی اضافہ کیا ہے۔(1)

۴- ایک ایسی معیشت میں جو نمو پذیر ہو کچھ وسائل، اس بات کے لئے بھی مخصوص کرنے ہوں گے کہ وہ اشیائے سرمایہ (Capital Goods) کی پیداوار کے کام آسکیں، ان اشیائے سرمایہ کی مدد سے طویل مدت میں مزید اشیائے صرف کی پیداوار کی جاسکتی ہے۔اس لئے کسی نہ کسی طرح ہر معاشی نظام کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ موجودہ صرف کو کس طرح محدود کیا جائے کہ کچھ بچت ہوسکے جس کو اشیائے سرمایہ کی پیداوار یعنی آئندہ صرف (Future Consumption) کے لئے استعمال کیا جاسکے۔فی الحقیقت یہ مسئلہ اوپر درج کئے گئے مسئلہ-1 (کن چیزوں کی پیداوار کی جائے) کا ہی ایک جز ہے۔لیکن اس کا تعلق مسئلہ-2 (پیداوار کیسے کی جائے) سے بھی ہے کیونکہ پیداوار میں اشیائے سرمایہ اور محنت دونوں استعمال کیے جاتے ہیں۔

۵- مسئلہ-1، 2، 3، 4، کا حل اس طرح کیا جائے کہ سماجی پیداوار کے عمل اس کے مختلف مراحل اور مختلف اجزاء میں ایک مناسب توازن پایا جائے۔اگر ان میں سے ایک مرحلہ یا جز میں تاخیر ہوگئی تو انجامِ کار، اس کا اثر مکمل پیداوار پر پڑے گا۔اس لئے خام اشیاء کی فراہمی، اشیائے سرمایہ کی فراہمی، محنت کی فراہمی، اور یہاں تک کے اشیائے صرف کی فراہمی میں بھی ایک مخصوص توازن کا ہونا ضروری ہے ورنہ ان کی فراہمی میں تاخیر کی وجہ سے پیداوار میں رکاوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے۔

۶- معاشی نظام کو ان مسائل اس انداز میں حل کرنا چاہیے کہ معیشت میں موجود تمام معاشی وسائل کا بہترین استعمال ہوسکے۔اور کسی وسیلہ کا زیاں نہ ہو۔کام کرنے لائق تمام محنت

کشوں کو ان کی لیاقت کے اعتبار سے روزگار مہیا ہو۔ اشیاء کی پیداوار اتنی مقدار میں ہو کہ کارخانوں میں لگی ہوئی مشینیں خواہ وہ اشیائے کے صرف کی پیداوار کرتی ہو یا اشیاء سرمایہ کی۔ بے کار نہ رہیں یعنی کارخانوں میں زائد صلاحیت نہ ہو بلکہ وہ اپنی پوری صلاحیت پر کام کریں، مختصراً یہ کہ مکمل روزگار کی صورت حال کو معیشت حاصل کر سکے۔

معاشی نظاموں کی تقسیم

فی زمانہ دنیا میں جو معاشی نظام رائج ہیں ان کو ہم تین بڑی قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- سرمایہ دارانہ معیشت

۲- اشتراکی معیشت

۳- مخلوط معیشت

آیئے اب ہم ان مختلف معاشی نظاموں کے بنیادی خدوخال اور ان کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ، ان معیاروں کی روشنی میں لیں جو ہم نے اوپر مقرر کیے ہیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت

سرمایہ دارانہ معیشت (Capitalist Economy) کو بازار معیشت (Market Economy) یا آزاد معیشت (Free Economy) بھی کہتے ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال سے ہی ظاہر ہے کہ یہ معیشت بازار کے نظام پر قائم ہے۔ اور اس پر حکومت کا کنٹرول اگر صفر نہ ہو تو کم از کم ضرور ہو۔

ہم عصر دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کی بہترین مثال ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا معاشی نظام ہے لیکن امریکہ میں بھی سرمایہ داری اب اپنی خالص شکل میں باقی نہیں رہی، اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ اس لئے ہم امریکہ یا برطانیہ یا کسی اور ملک کی مثال لئے بغیر خالص

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک مجرد تصور قائم کریں گے اور اس کے سیاق وسباق میں سرمایہ داری کا مطالعہ کریں گے۔

سرمایہ دارانہ نظام سے ہماری مراد معیشت کے ایک ایسے نظام سے ہے جس میں افراد کو ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کا حق حاصل ہو، اور معاشی افعال کو سرانجام دینے کے لئے حکومت کی جانب سے کوئی منصوبہ نہ بنایا جاتا ہو بلکہ یہ افعال، آزاد قیمتوں کے نظام کی وساطت سے انجام پذیر ہوتے ہوں۔ ایسی معیشت میں کن چیزوں کی پیداوار کی جائے، کے مسئلہ کا حل افراد خود کرتے ہیں لیکن وہ یہ فیصلہ براہِ راست نہیں کرتے بلکہ اس کا فیصلہ قیمتوں، لاگتوں اور منافع کا ایک پیچیدہ نظام کرتا ہے۔ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کی وجہ سے ہر فرد، اور افراد کے گروہوں کو کاروبار کا حق ہے یعنی انھیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جس چیز کی چاہیں پیداوار کریں لیکن ہر فرد کا عمل، اس کی خودرائی، یا خودسری سے متعین ہونے کے بجائے اس کے مفاد سے متعین ہوتا ہے۔ اس لئے افراد صرف ان اشیاء کی پیداوار کریں گے جس میں ان کو معقول منافع حاصل ہو سکے، چیزوں کی پیداوار کے لئے مختلف وسائل کی خدمات کی ضرورت پڑے گی، چونکہ یہ تمام خدمات معاشی اشیاء ہیں اس لئے ان کی قیمت بھی چکانی پڑے گی، کسی چیز کی پیداوار میں جتنے وسائل استعمال ہوئے اور ان کے لئے مجموعی طور پر جو قیمت ادا کی گئی وہ اس چیز کی لاگت ہے، پیدا کار (Producer) یہ چاہیں گے کہ ان کو جو قیمت اس چیز کی فروخت سے حاصل ہو وہ لاگت سے زیادہ ہو۔ قیمت فروخت اور لاگت کے درمیان یہ فرق منافع کہلاتا ہے۔ اس لئے پیدا کار صرف ان اشیاء کی پیداوار کرنا پسند کریں گے جن میں منافع کا امکان زیادہ ہو۔ اب صرف یہ مسئلہ رہ گیا کہ پیدا کاروں کو یہ اندازہ کس بات سے ہو کہ کن اشیاء کی پیداوار میں انھیں منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ یہاں پر آزاد قیمتوں کا نظام ایک بار پھر پیدا کاروں کی اعانت کرتا ہے، صارفین جن اشیاء کی مانگ کرتے ہیں، وہ اپنے آپ کو قیمتوں میں ظاہر کرتی ہے۔ جن اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہیں اور

ان میں اضافہ ہورہا ہے۔ لازماً ان کی مانگ میں اضافہ ہورہا ہوگا اس لئے پیداکار انھیں اشیاء کی پیداوار کریں گے تاکہ ان کی پیداوار فروخت ہوجائے اور وہ اس فروخت کے نتیجہ میں منافع کما سکیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت دوسرے مسئلہ یعنی پیداوار کس طرح کی جائے، کا حل بھی نظام قیمت کی مدد سے ہی کرتی ہے۔ پیداوار کے لئے جو وسائل استعمال ہوتے ہیں ان کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے، سرمایہ اور محنت۔ پیداکاران دونوں ذرائع پیداوار کی متناسب قیمتوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے ایسی پیداواری تکنیک کا انتخاب کرتے ہیں جس میں پیداواری لاگت کم ترین ہو۔

تیسرا مسئلہ (یعنی پیداوار کس کے لئے کی جائے) بھی سرمایہ دارانہ معیشت میں نظام قیمت کے ذریعہ ہی سے حل ہوتا ہے، اس بات کا تذکرہ ہوچکا ہے کہ ہر فرد کسی نہ کسی ذریعۂ پیداوار کا مالک ہے۔ نظام قیمت درحقیقت دو عناصر سے مل کر بنا ہے۔ (1) پیدا شدہ اشیاء کا بازار (Product Market) (2) ذرائع پیداوار کا بازار (Factor Market) جس طرح پیدا شدہ اشیاء (خواہ وہ اشیائے صرف ہوں یا اشیائے سرمایہ) کی قیمتیں ہر شے کی طلب اور رسد سے متعین ہوتی ہیں اسی طرح ذرائع پیداوار کے بازار میں ہر ذریعۂ پیداوار کی قیمت اس کی طلب اور رسد سے متعین ہوتی ہے۔ محنت کی مزدوری کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ محنت کی رسد کتنی ہے اور طلب کتنی ہے۔ مزدوری کی جس شرح پر محنت کی طلب اور رسد برابر ہوگی وہیں متوازن مزدوری کی شرح (Equilibrium Wage Rate) کا تعین ہوگا، اسی طرح سرمایہ کے بازار (Capital Market) میں سرمایہ کی طلب اور رسد کی برابری کے ذریعہ متوازن شرح سود کا تعین ہوگا اسی اصول پر متوازن شرح لگان کا تعین کیا جاسکتا ہے، اس طرح کل پیداوار محنت، سرمایہ اور زمین کے مالکان میں مزدوری، سود اور لگان کی شکل میں تقسیم ہوجائے گی۔

مندرجہ بالا خاکہ سرمایہ دارانہ نظام کی کارکردگی کی ایک مجمل اور آسان ترین وضاحت ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ یہ بڑا پیچیدہ اور مشکل نظام ہے کیونکہ اس میں معاشی فیصلوں کی حیثیت لامرکزی ہے۔ خیال تو کیجئے کہ معیشت میں کروڑوں کی تعداد میں افراد ہوتے ہیں۔ ہر فرد اپنے طور پر اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کتنی مقدار میں کتنی اشیاء صرف کرے گا، اسی اعتبار سے وہ اپنی انفرادی طلب کرتا ہے، لاکھوں پیداکار ایک دوسرے سے جداگانہ اور علاحدہ طور پر اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ کن اشیاء کی کتنی مقدار میں پیداوار کریں گے اور اس پیداوار کو بروئے کار لانے کے لئے کس تناسب اور کتنی مقدار میں پیداواری وسائل کی طلب کریں گے۔ ہر ذریعۂ پیداوار کا مالک انفرادی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اپنے وسیلہ کو کس طرح کے استعمال میں لانا پسند کرے گا۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ جدید معیشت اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں مختلف قسم کی اشیاء اور خدمات کی پیداوار کرتی ہے اس لئے ان تمام اشیاء اور خدمات کی پیداوار کے لئے کیے جانے والے انفرادی فیصلوں کی تعداد کا بہ مشکل تمام ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ان تمام فیصلوں میں ترتیب اور توازن نظامِ قیمت کے ذریعہ پیدا کیا جاتا ہے۔ چونکہ انفرادی فیصلے زیادہ تر انفرادی مفادات کے پیش نظر کیے جاتے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ مجموعی طور پر یہ فیصلے اجتماعی مفادات اور مصالح سے بھی مطابقت رکھتے ہوں۔ اس امکان کو سرمایہ دار ممالک کے ماہرین معاشیات بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ جارج ہام لکھتے ہیں:

> ''بلاشبہ یہ فرض نہیں کرلینا چاہیے کہ یہ فیصلے، اندازے اور ان کی تطبیق ہمیشہ درست ہوں گے، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) کن چیزوں کی پیداوار کی جائے، کس طرح کی جائے اور کس کے لئے کی جائے، یہ مسائل نجی اعمال کے ذریعہ محرک منافع (Profit Motive) کی بنیاد پر آزمائش اور غلطی (Trial and error) کی حکمت عملی (Strategy) سے طے کیے جاتے ہیں''۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی خدوخال

سرمایہ دارانہ معیشت کے مندرجہ بالا مختصر تعارف کے بعد ہم ذیل میں سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی خدوخال اور اس کے سماجی اور قانونی اداروں کے ذریعہ اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالیں گے۔ اس امر کا اعادہ ایک بار پھر ضروری ہے کہ یہ کسی خاص ملک کی سرمایہ دارانہ معیشت کا تجزیہ نہیں ہے بلکہ کسی بھی آزاد معیشت کا جس کی بنیاد بازار کا نظام ہو ایک مجرد نمونہ ہے۔

(الف) ذاتی جائداد کا حق

ایک سرمایہ دارانہ معیشت کی بنیاد ذاتی جائداد کے حق پر ہوتی ہے، افراد اور ان کے گروہوں کو اس بات کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اشیائے صرف بلکہ تمام ذرائع پیداوار کو جن میں اشیائے سرمایہ، محنت اور زمین شامل ہیں، اپنی ذاتی ملکیت میں رکھ سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے مجرد نمونہ میں جائداد کی ذاتی ملکیت کا حق لامحدود ہے اور نجی ملکیت پر کسی طرح کی روک ٹوک یا پابندی نہیں ہوتی۔

افراد کو صرف اس بات کا ہی حق نہیں ہوتا کہ وہ ذرائع پیداوار یا دولت یا جائداد اپنی نجی ملکیت میں رکھ سکتے ہیں بلکہ اس حق سے ہی مشتق ایک اور بنیادی حق ہے کہ وہ اس دولت یا جائداد میں اضافہ کرنے کے لئے نجی کاروبار کر سکتے ہیں۔ نجی کاروبار کے حق کے بغیر ذاتی جائداد کا حق چنداں بامعنی اور مفید نہ ہوگا۔

سرمایہ دارانہ معیشت میں افراد کو اس بات کا بھی حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی ملکیت کو استعمال کر سکتے ہیں۔ فروخت کر سکتے ہیں، سرمایہ کاری کے ذریعہ مزید آمدنی حاصل کر کے اس میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی حق ہوتا ہے اگر وہ چاہیں تو اپنے وسائل کو بروئے کار نہ لائیں یا انھیں ضائع کر دیں۔

جائداد کی ذاتی ملکیت کے حق کے ذیل میں ہی مندرجہ ذیل حقوق بھی آتے ہیں:

(1) افراد کو وراثت کا حق بھی ہے یعنی جائداد کے مالکان اپنی وفات کے بعد اپنی ملکیت کو اپنے ورثا کی طرف منتقل کر سکتے ہیں اور اپنے آبا و اجداد کی ملکیت کو ورثہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حق کے مضمرات معاشی نظام کے لئے نہایت اہم ہیں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں، جائداد اور ذرائع پیداوار یا دولت کا مالک بننے کا صرف یہی ذریعہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی محنت اور قابلیت کے ذریعہ دولت پیدا کرے اور اس کو بڑی مقدار میں جمع کر لے، اگر دولت کا مالک بننے کا صرف یہی ایک طریقہ رائج ہو تو غالباً بہت سے لوگ اس کو معقول خیال کریں گے اور نامناسب نہ سمجھیں گے۔ لیکن حق وراثت کی موجودگی کی وجہ سے ایک شخص صرف اس لئے بھی بے اندازہ دولت کا مالک بن سکتا ہے کہ اس نے کسی راک فیلر، فورڈ، ٹاٹا، یا برلا خاندان میں جنم لیا ہے اور اس کے آبا و اجداد نے یہ دولت اس کے نام منتقل کر دی ہے۔ بالفاظ دیگر سرمایہ دارانہ معیشت میں یہ ایک ایسا طریقہ موجود ہے جس کے ذریعہ کوئی شخص محض اپنی قابلیت یا محنت صرف کیے بغیر بھی دولت کا مالک بن سکتا ہے، عہد جدید میں حق وراثت کو ایک طرح سے لامحدود حق نہیں مانا جاتا کیونکہ بعض سماجی مصالح کی خاطر حکومت ورثہ کے طور پر منتقل کی جانے والی جائداد اور دولت پر ٹیکس لگاتی ہے۔ اور اس طرح منتقل ہونے والی جائداد کا کچھ حصہ حکومت کو مل جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ حق وراثت، جائداد کی ذاتی ملکیت کے حق کا جزء لاینفک ہے۔

(2) آزاد کاروبار کا حق کا بھی جائداد کی ذاتی ملکیت کے حق سے جڑا ہوا ہے، اس کے تحت مندرجہ ذیل امور آتے ہیں:

(الف) افراد کو کاروبار کرنے کی آزادی ہے اور وہ اپنی نجی جائداد جس کاروبار میں چاہے لگا سکتے ہیں، اس بات کا فیصلہ کہ وہ اپنے وسائل کا کاروباری استعمال کس طرح کریں،

بنیادی طور پر افراد کے ہاتھ میں ہے۔ حکومت یا کوئی اور سماجی تنظیم یا ادارہ وسائل کے مالکان کو اس بات کا حکم نہیں دیتا کہ ان کو اپنے وسائل فلاں کاروبار میں لگانے ہوں گے یا فلاں شخص کو لازماً فلاں قسم کا کاروبار کرنا چاہیے۔ مالکان وسائل محرکِ منافع (Profit Motive) کی بنیاد پر اپنے وسائل کاروبار میں لگاتے ہیں اور اسی بنیاد پر مختلف کاروباروں میں سے کسی ایک یا چند کا اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں، سرمایہ دارانہ معیشت کے لئے آزاد کاروبار کا حق اتنا اہم ہے کہ اس نظامِ معیشت کا متبادل نام "آزاد کاروباری معیشت" (Free Enterprise Economy) بھی ہے۔

(ب) سرمایہ دارانہ معیشت میں افراد کو "معاہدوں کی آزادی" بھی حاصل ہوتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ مختلف قسم کے معاشی معاہدے کرنے کے لئے آزاد ہیں، یہ معاہدے سرمایہ داروں اور محنت کشوں یا دو مختلف سرمایہ داروں کے مابین ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ معاہدے کی آزادی، آزاد کاروبار کے شروع ہونے اور جاری رہنے کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ محض مادی وسائل یا جائداد (یا مشینوں) کی مدد سے پیداواری عمل تکمیل تک نہیں پہنچایا جاسکتا، اس کے لئے محنت کی بھی ضرورت ہے جو مشینوں کو بروئے کار لائے، محنت کے مالکان یعنی محنت کش، سرمایہ دارانہ نظام کے تحت سرمایہ داروں کے غلام نہیں ہیں۔ (جیسا کہ جاگیر دارانہ نظام میں ہوتا ہے کہ جاگیر دار نہ صرف یہ کہ زمین کا مالک ہوتا ہے بلکہ ان پر کام کرنے والے کاشتکاروں کا بھی مالک ہوتا ہے) کم از کم نظریاتی طور پر محنت کشوں کو سرمایہ داروں کی ہم سری کا مقام حاصل ہے، سرمایہ دار، کیا ہے؟ محض ایک ذریعۂ پیداوار سرمایہ کا مالک ہے۔ اسی طرح محنت کش، ایک دوسرے ذریعۂ پیداوار محنت کا مالک ہے، دونوں اپنے اپنے طور پر آزاد ہیں کہ اپنے وسیلہ کو جس کاروبار میں چاہے استعمال کریں یا نہ کریں۔ اس لئے نظری طور پر دونوں فریق برابر کی حیثیت رکھتے ہیں، چونکہ پیداواری عمل، بغیر سرمایہ یا بغیر محنت کے، جاری رکھنا، اگر ناممکن نہیں، تو مشکل اور غیر کارگذار (Inefficient) ضرور ہے اس لئے معاہدے کی آزادی،

ضروری ہو جاتی ہے تا کہ سرمایہ اور محنت ایک دوسرے سے باہمی تعاون کے ذریعہ پیداوار کے سماجی عمل کو جاری رکھ سکیں۔

یہ امر ماہرین معاشیات کے مابین متنازعہ فیہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں افراد کا حقِ ملکیتِ جائداد لامحدود ہے یا نہیں۔ بعض جدید ماہرین معاشیات کا خیال ہے ہم عصر سرمایہ دارانہ نظام میں حق ملکیت لامحدود نہیں ہے اور حکومت اس حق کو محدود کرنے کے لئے مختلف قسم کے مالیاتی اقدامات کرسکتی ہے۔ اور اس کے لئے قوانین بھی بنا سکتی ہے، گو کہ اس قسم کے براہِ راست قوانین تو سرمایہ دار ممالک میں نہیں بنائے گئے لیکن اس کے نظری امکان کو تو بہر حال رد نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد کاروبار کے حق کے بارے میں بھی یہ ہی کہا جاتا ہے کہ یہ حق بھی لامحدود نہیں ہے، بہت سے ایسے کاروبار ہیں جن کو حکومت اپنے لئے محفوظ رکھتی ہے لیکن خالص سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں یہ اعتذار درحقیقت درست نہیں ہے کیونکہ ایسے نظام میں حکومت جو معاشی افعال انجام دیتی ہے وہ درحقیقت سماجی اشیاء کی فراہمی کے لئے ہے۔

(ب) صارفین کی حاکمیت (Consumer's Sovereignty)

سرمایہ دارانہ معیشت کی دوسری بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس میں صارفین کی حاکمیت قائم ہوتی ہے۔ حاکمیت کا تصور دراصل سیاسیات سے مستعار لیا گیا ہے۔ سیاسیات میں جمہوری نظام میں رائے دہندگان کو اصل حاکم (Sovereign) متصور کیا جاتا ہے کیونکہ عام انتخابات کے وقت رائے دہندگان ہی حکومت کا انتخاب کرتے ہیں اور وہی اُن کو اگلے انتخاب کے وقت تبدیل کرسکتے ہیں۔ اس لئے حاکمیت اس فرد یا طبقے کے پاس ہوگی جس کے سب تابع ہوں لیکن جو خود کسی کا تابعِ فرمان نہ ہو۔ چونکہ جمہوریت میں رائے دہندگان سے بالا کوئی نہیں اور حکومت کا وجود بھی اس پر منحصر ہے کہ رائے دہندگان کی مسلسل حمایت اسے حاصل رہتی ہے یا نہیں۔ اس لئے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حاکمیت ان ہی کے پاس ہے۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے حامی مفکرین سرمایہ داری کو ''معاشی جمہوریت'' (Economic Democracy) کہنا پسند کرتے ہیں۔ پیداکار جو اصل پیداوار کرتے ہیں۔ وہ حکومت کے ان نمائندوں کے مماثل ہیں جن کا انتخاب، رائے دہندگی کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، رائے دہندگان کی جگہ صارفین نے لے لی ہے۔ جس طرح رائے دہندگان (Voters) اپنی جگہ حاکمیت کے حامل ہیں اسی طرح معاشی دائرۂ کار میں صارفین بھی حاکمیت کے حامل ہیں، اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کوئی پیداکار، کسی بھی چیز کی پیداوار اپنی مرضی سے نہیں کرتا، چونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار بازار کے لئے کی جاتی ہے اور پیداوار کا مقصد یہ ہے کہ وہ بازار میں فروخت ہو اس لئے پیداکار اپنے من کی موج کے بجائے بازار کے احکامات بجالانے پر مجبور ہیں۔ وہ صرف ان ہی اشیاء کی پیداوار کریں گے جن کی صارفین مانگ کرتے ہوں اور جن کی خریداری کے لئے وہ تیار ہوں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ جن چیزوں کی پیداوار ہوتی ہے اس کا آخری فیصلہ صارفین کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر صارفین کسی چیز کا استعمال بند کردیں، تو پھر پیداکار زیادہ دن تک اس چیز کی پیداوار جاری نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ فروخت نہ ہونے کے باعث اس کو مسلسل نقصان ہوگا جس کو وہ کچھ عرصہ تک تو برداشت کرلے گا لیکن طویل مدت تک برداشت نہیں کرپائے گا۔ چاروناچار اس کو اس چیز کی پیداوار ختم کرنا پڑے گی۔ صارفین کی حاکمیت کا مفہوم یہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ حاکمیت عمل میں کس طرح آتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سیاسی جمہوریت میں تو ''ایک شخص ایک ووٹ'' کا اصول ہے، معاشی جمہوریت میں اس کا مماثل ''ایک روپیہ ایک ووٹ'' کا اصول ہے۔ (امریکی ماہرین معاشیات اسے ''ڈالر بیلٹ'' کہتے ہیں) ہم کو یہ معلوم ہوچکا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں صارفین ان اشیاء کا انتخاب خود کرتے ہیں جن کو وہ صرف کرنا چاہتے ہیں، یہ انتخاب مندرجہ ذیل عاملین سے متاثر ہوتا ہے۔ (1) صارفین کے

انفرادی حالات ور جحانات مثلاً عمر، جنس، تعلیم، تہذیبی پس منظر، خاندان کا سائز اور اس کی بناوٹ وغیرہ، (2) صارفین کی ذاتی آمدنی، (3) آمدنی کا وہ حصہ جو وہ صرف پر خرچ کرنا چاہتا ہے، (4) ان اشیاء اور خدمات کی قسمیں جن کو وہ فی الواقع خریدنا چاہتا ہے، (5) دوسری اشیاء اور خدمات کی قسمیں جن کو وہ ممکنہ طور پر خرید سکتا ہے۔

اشیاء کا انتخاب عمل میں لانے کے لئے صارفین ڈالر بیلٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ صارفین کے ذریعہ خرچ کیا گیا ہر ایک روپیہ ایک ووٹ کے مثل ہے، جس طرح سیاسی میدان میں وہ امیدوار کامیاب ہوتا ہے جس کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے ہیں اسی طرح یہاں صرف ان اشیاء کی پیداوار ہوگی جن پر صارفین اپنی آمدنی خرچ کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے بادی النظر میں صارف کا یہ عمل کسی غیر معمولی اہمیت کا حامل نہ معلوم ہو لیکن لاکھوں افراد کے فیصلے مل کر اس امر کا تعین کرتے ہیں کہ کن اشیاء اور خدمات کی پیداوار کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہو، جب صارفین بعض اشیاء پر زیادہ خرچ کرتے ہیں تو ان کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے ان کی قیمت فروخت بڑھتی ہے۔ اور منافع بھی زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ پیداکار ان چیزوں کی زیادہ پیداوار کرتے ہیں، اگر صارفین کچھ دوسری چیزوں پر کم خرچ کرتے ہیں۔ تو ان کی مانگ گھٹتی ہے، جس کی باعث قیمت فروخت کم ہوجاتی ہے اور منافع کا حاشیہ بھی کم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ پیداکار ان اشیاء اور خدمات کی پیداوار میں کمی کردیں گے۔

اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ سرمایہ داری کو معاشی جمہوریت قرار دے کر سیاسی جمہوریت سے اس کی جو تمثیل کی جاتی ہے وہ مکمل طور پر صحیح نہیں ہے۔ سیاست میں تو ''ایک شخص ایک ووٹ'' کا اصول تمام بالغ رائے دہندگان کے لئے نافذ ہوسکتا ہے اور اس کے نفاذ میں رنگ، نسل، امیر و غریب کی تخصیص نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ''ایک روپیہ ایک ووٹ'' کا اصول۔ ایک شخص ایک ووٹ کے اصول کا صحیح اور مکمل متبادل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ معیشت کے بہت سے لوگ

جو قوت خرید نہیں رکھتے اس کے دائرے سے باہر ہو جاتے ہیں، امیر لوگوں کو ان کے تناسب کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، ایسے لوگ اگر غیر ضروری اور غیر مفید سامان تعیش کی بھی مانگ کرتے ہیں تو آزاد بازار معیشت اس کی تسکین کے لئے پیداواری وسائل مختص کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے لیکن ضروری، مفید اور کبھی کبھی سماجی نقطۂ نظر سے اہم ترین اشیاء اور خدمات بھی وافر مقدار میں صرف اس لئے مہیا نہیں ہو پاتیں کہ ''ایک روپیہ ایک ووٹ'' کے اصول کے تحت لوگ ان پر زیادہ رقم خرچ نہیں کرتے اور اس طرح بازار معیشت ان اشیاء و خدمات کے لئے کم ترجیح دیتی ہے۔

چنانچہ یہ جانی مانی حقیقت ہے کہ بعض سرمایہ دار ممالک میں قومی آمدنی کا جتنا حصہ شراب پیدا کرنے پر صرف ہوتا ہے اتنا حصہ تعلیم یا صحت سے متعلق سہولیات فراہم کرنے پر صرف نہیں ہوتا۔

(ج) انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice)

آزاد بازار کی بنیاد پر قائم سرمایہ دارانہ معیشت اسی وقت کامیابی سے کام کر سکتی ہے جبکہ مندرجہ بالا خصوصیات کے ساتھ افراد کو انتخاب کی آزادی بھی حاصل ہو، اس آزادی کے تحت مندرجہ ذیل قسم کے امور آتے ہیں:

۱- اشیائے صرف میں انتخاب کی آزادی

۲- صرف اور بچت میں انتخاب کی آزادی

۳- سرمایہ کاری کی آزادی

۴- پیشوں کے انتخاب کی آزادی

صارفین کی حاکمیت کی بحث میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت

پیدا کاروں کی رہنمائی، اس امر میں کہ وہ کن اشیاء کی پیداوار کتنی مقدار میں کریں، صارفین کی ترجیحات سے ہوتی ہے کیونکہ ہر صارف (Consumer) مختلف اشیاء پر اسی تناسب سے خرچ کرتا ہے جو وہ اپنے ذہن میں ان ضروریات کی ترجیحات کی بابت مقرر کرتا ہے۔ پیدا کاروں کی یہ رہنمائی اسی وقت ممکن ہے کہ جبکہ افراد کو صارفین کی حیثیت سے مختلف اشیائے صرف میں سے انتخاب کی آزادی ہو۔ اس آزادی کے بغیر سرمایہ دارانہ نظام کا کامیابی سے کام کرنا مشکل ہے۔

جائداد کی ذاتی ملکیت کے حق کے ساتھ افراد کو پیشوں کے انتخاب کی آزادی بھی ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص جس قسم کا پیشہ چاہے اختیار کر سکتا ہے، پیشوں کی آزادی کو سرمایہ دارانہ نظام کے حامی مفکرین، اس کو فطرت انسانی سے ہم آہنگ نظام ہونے کے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، ان کا نکتہ یہ ہے ہر فرد کی آرزوئیں اور امنگیں مختلف ہوتی ہیں، کسی کا مقصد علم کی خدمت کرنا ہے اور وہ یونیورسٹی میں پروفیسر بننا چاہتا ہے۔ کسی اور فرد کا مقصد دولت کمانا ہے اور وہ صنعت کار بننا چاہتا ہے، کوئی ڈاکٹری کا پیشہ اپنانا چاہتا ہے اور کوئی سپہ گری کا۔ کوئی آہن گر بننا چاہتا ہے اور کوئی زرگر، کوئی بنک کار بننا چاہتا ہے تو کوئی پیشہ ور انجینئر۔ معاشی نظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا مناسب اور بہترین موقع فراہم کرے۔ تاکہ وہ اپنی قابلیت، صلاحیت اور امنگوں کے مطابق پیشے کا انتخاب کر کے اپنی آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ اپنے خوابوں اور حوصلوں کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کر سکے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جبکہ افراد کو پیشوں کے انتخاب میں آزادی کا حق حاصل ہو۔ واضح رہے کہ یہ آزادی سرمایہ دارانہ نظام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اس سے قبل زمین دارانہ اور جاگیردارانہ نظاموں میں پیشہ، ذات اور جنم سے ہی متعین ہو جاتا تھا۔ جاگیردار کا بیٹا جاگیردار تھا اور کسان کا بیٹا کسان، لوہار کا بیٹا لوہار تھا اور بڑھئی کا بیٹا بڑھئی، بڑی حد تک پیشوں کا انتخاب سماجی ریت رواج پر منحصر تھا اور انفرادی ترجیح کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو سرمایہ دارانہ نظام کی پیش رفت جاگیردارانہ

نظام پر کچھ زیادہ فوقیت نہیں رکھتی کہ سرمایہ دار کا بیٹا سرمایہ دار اور محنت کش کا بیٹا محنت کش ہی بنتا ہے،
فی الواقع اس کا بہت کم امکان ہے کہ سرمایہ دار کا بیٹا محنت کش اور محنت کش کا بیٹا سرمایہ دار بن
جائے۔ (یادر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام حق وراثت اور ذاتی ملکیت کی بناء پر ممتاز و ممیّز کیا جاتا ہے)
جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہائے معیشت میں اس بابت میں جو فرق ہے وہ ان کی جدلیاتی
ترکیب کے باعث ہے۔ جاگیردارانہ نظام میں پیشوں کی تعداد محدود ہوتی ہے لیکن ہم عصر سرمایہ
داری نظام لاتعداد قسم کے پیشوں کی ضرورت پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ اس اعتبار سے پیشوں
کے انتخاب کے امکانات میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کو جاگیردارانہ نظام
پر ایک اور اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ اس نے پیشوں کے انتخاب کو رسم و رواج اور ذات پات
کی زنجیروں سے آزاد کر کے بازار کی قوتوں یعنی طلب و رسد کا پابند بنادیا ہے۔

ذاتی جائداد اور پیشہ دونوں سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ فی الحقیقت اس نقطۂ نظر سے
ہم آمدنی کی بھی دو قسمیں کر سکتے ہیں:

الف- کسبی آمدنی یا کمائی آمدنی (Earned Income) جو انسان کی کسی کوشش کے
ذریعہ کمائی گئی۔ مزدوری، تنخواہیں اور وہ تمام ادائیگیاں جو کسی انسانی خدمت انجام دینے کے صلہ
میں حاصل کی گئیں، اس قسم کی آمدنی میں شامل ہیں۔

ب- غیر کسبی یا غیر کمائی آمدنی (Unearned Income) جو محض کسی معاشی وسیلہ کی
ملکیت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً زمین دار کو لگان محض اس وجہ سے ملتا ہے کہ وہ زمین کا
مالک ہے، سرمایہ دار کو ''سود'' اس وجہ سے ملتا ہے کہ وہ سرمایہ کا مالک ہے۔ اس قسم کی آمدنی کو
حاصل کرنے کے لئے کسی خاص قسم کی معاشی کوشش کی ضرورت نہیں ہے۔

اس تخصیص کا ذکر بر سبیلِ تذکرہ یوں آ گیا کہ ہم یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ آمدنی ذاتی
جائداد اور پیشے دونوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ فی الوقت آمدنی کا جو مصرف زیر بحث ہے اس

میں اس تخصیص سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کمائی آمدنی ہے یا غیر کمائی۔ آمدنی کسی طرح بھی حاصل کی گئی ہو اس کو مندرجہ ذیل دو مصارف میں سے کسی ایک یا دونوں پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۱- آمدنی کو مختلف ضروریات کی تسکین کے لئے مختلف قسم کی اشیائے صرف اور خدمات کے خریدنے پر خرچ کیا جائے۔ اصطلاحاً ہم ایسے خرچ کو (Consumption) ''صرف'' سے تعبیر کریں گے۔

۲- آمدنی کا دوسرا استعمال یہ ہوسکتا ہے کہ موجودہ ضروریات پر خرچ کرنے کے بجائے اس کو بچالیا جائے اور مستقبل میں آئندہ پیدا ہونے والی ضروریات پر صرف کیا جائے۔ آمدنی کے ایسے حصے کو جو موجودہ صرف پر خرچ نہ کیا جائے ہم ''بچت'' سے تعبیر کریں گے۔

اس طرح سے آمدنی کے دو متبادل استعمال ہوئے۔ صرف اور بچت۔ نظری طور پر دو انتہائی صورتیں ممکن ہیں۔ اول یہ کہ کل آمدنی کو موجودہ صرف پر خرچ کردیا جائے۔ ایسی صورت میں بچت صفر ہوگی اور آئندہ برس، صرف کے لئے کچھ آمدنی نہ ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ موجودہ زمانے (Period) میں کچھ صرف نہ کیا جائے اور پوری موجودہ آمدنی بچت کی صورت میں رکھ لی جائے۔ اس سے موجودہ زمانے (Current Period) میں تو صرف ''صفر'' ہو جائے گا لیکن آئندہ زمانے مین صرف کے لئے خاصی بڑی آمدنی حاصل ہو سکے گی۔ یہ دونوں صورتیں قابل عمل نہیں ہیں۔ افراد اور معاشرہ دونوں کے لئے قابل عمل بات یہ ہے کہ موجودہ آمدنی کا کچھ حصہ موجودہ زمانے میں صرف کے لئے خرچ کیا جائے اور جو کچھ خرچ نہ ہو اس کو بچت کی صورت میں آئندہ کے لئے محفوظ کرلیا جائے۔

آمدنی میں بچت اور صرف کا کیا تناسب ہو؟ کتنی آمدنی موجودہ زمانے میں صرف پر خرچ کی جائے اور کتنی بچت کی جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اس کا فیصلہ بھی افراد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ افراد اور گھرانے، اس بات کا فیصلہ خود کرتے ہیں کہ ان کی ضروریات کیا ہیں؟ ان

ضروریات کی تسکین کے لئے ان کو اپنی آمدنی کا کتنا حصہ صرف پر خرچ کرنا چاہیے، ظاہر ہے کہ اس فیصلے کا انحصار بہت سی باتوں پر ہوگا۔ گھرانہ کا سائز کتنا بڑا ہے۔ اس کی بناوٹ کیسی ہے، اس کی فی کس آمدنی کتنی ہے۔ اس میں کتنے لوگ کام کرتے ہیں۔ کتنے متوسلین (Dependants) ہیں۔ ان کی عمریں کتنی ہیں، گھر کے کتنے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ بچت اور صرف میں سے انتخاب کا حق افراد کے پاس ہے اور وہ خود اپنے ذاتی حالات وعوامل کے پیش نظر اپنے صرف کا منصوبہ تیار کرتے ہیں۔ کوئی سرکاری ایجنسی اس سلسلے میں ان کی رہنمائی نہیں کرتی۔

ایک بار یہ طے کر چکنے کے بعد کہ افراد اپنی آمدنی کا کتنا حصہ صرف کریں گے، یہ طے کرنے کی باری آتی ہے کہ فی الواقع وہ صرف کن اشیاء اور خدمات پر مشتمل ہوگا اور جملہ اشیائے صرف اور خدمات کی کتنی مقدار کون سا گھرانہ یا کون سا فرد استعمال کرے گا۔ یہ اشیائے صرف کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام میں اس انتخاب کی آزادی کا حق بھی افراد کے پاس ہے۔ صارفین کی حاکمیت کے اصول کی بحث میں ہم اس حق اور اس کی کارکردگی پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس حق کے استعمال کیوجہ سے ہی صارفین اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کن اشیاء اور خدمات کی پیداوار کی جائے۔ کیونکہ پیداکار (Producer) انھیں اشیاء اور خدمات کی پیداوار کرتے ہیں جن کی صارفین مانگ کرتے ہیں اس لئے اس جگہ پر اس کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے تاہم، اس امر پر زور دینا ضروری ہے کہ افراد کے انتخاب کو محض معاشی انتخاب کی حیثیت حاصل ہے۔ ضروری نہیں کہ سماجی اور اخلاقی معیاروں پر بھی یہ انتخاب درست ہی ہو۔ اس کو واضح کرنے کے لئے ہم ایک مثال لیتے ہیں۔ فرض کیجئے عبدل نام کا ایک مزدور ہے، جس کے گھر میں بیوی اور بچے ہیں۔ وہ اپنی تنخواہ کے دن، بیوی اور بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی شراب کی دوکان پر جاتا ہے اور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ شراب پر خرچ کرتا ہے۔ اخلاقی اور سماجی نقطۂ نظر

سے یہ کوئی مستحسن فعل قرار نہیں پائے گا لیکن سرمایہ دارانہ معاشیات اس فعل پر کوئی اخلاقی فیصلہ دینے سے احتراز کرے گی۔ عبدل شراب خریدتا ہے اور شراب بیچنے والا بیچتا ہے۔ اس کے لئے عبدل محض ایک خریدار ہے۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کا فیصلہ خود عبدل کو کرنا ہے کہ وہ شراب پیئے گا یا نہیں۔ اس کے لئے شراب زیادہ ضروری ہے یا اس کے بیوی بچوں کے لئے روٹی۔ اس سے شراب بیچنے والے کو کوئی غرض نہیں۔ وہ تو عبدل سے شراب کی قیمت وصول کرے گا اور اس کو شراب دے دے گا، اگر اس کی ترجیحات غلط ہیں تو ہوا کریں۔ معیشت تو ان ترجیحات کے مطابق ہی کام کرے گی۔

جب افراد یہ طے کرلیں کہ وہ آمدنی میں کتنا صرف کریں گے اور کتنی بچت کریں گے تو ان کو سرمایہ کاری کی آزادی بھی ہونا چاہیے۔ تمام معاشی وسائل کی طرح بچت بھی افراد کی ذاتی ملکیت ہے۔ اس لئے یہ طے کرنا بھی افراد کا کام ہے کہ وہ اپنی بچت کو کس شکل میں رکھنا پسند کریں گے۔ وہ اس کو بینک میں میعادی کھاتے میں رکھیں گے یا اس کے سرکاری تمسکات خریدیں گے یا اس کے مختلف کمپنیوں کے حصص (Shares) خریدیں گے یا کسی صنعت میں سرمایہ کاری کریں گے۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ سرمایہ کاری کی مختلف متبادل اشکال میں متوقع منافع (Expected Profit) کی شرح کتنی ہے، مختلف صنعتوں میں جس تناسب سے سرمایہ کاری کی جائے گی اسی اعتبار سے اس صنعتوں کی پیداواری صلاحیت متعین ہوگی اور اسی فیصلے سے اس امر کا تعین بھی ہوگا کہ مختلف چیزوں کی پیداوار کس مقدار میں ہو۔

سرمایہ کاری، چیزوں کی پیداوار اور ان کی فروخت کے نتیجہ میں افراد کو پھر آمدنی حاصل ہوگی اور اس آمدنی کے بارے میں انکو پھر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اس کا کتنا حصہ صرف کے لئے استعمال کریں گے اور کتنا حصہ بچت اور سرمایہ کاری کے لئے مختص کریں گے۔ سرمایہ کاری کے ذریعہ جائداد میں بھی اضافہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ آمدنی میں مزید اضافہ ممکن ہے۔

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انتخاب کی آزادی کے ضمن میں آنے والے چاروں حقوق، یعنی پیشوں کے انتخاب میں آزادی کا حق، اشیائے صرف میں انتخاب کی آزادی کا حق، صرف اور بچت میں انتخاب کی آزادی کا حق اور سرمایہ کاری کی آزادی کا حق ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں افراد کے ذریعہ کئے جانے والے معاشی فیصلوں کے ذریعہ ہی معیشت اپنے وسائل کو تقسیم کرتی ہے اور اپنے دیگر فرائض انجام دیتی ہے۔

(د) محرک منافع (Profit Motive)

سرمایہ دارانہ معیشت میں معاشی اعمال کو چلانے والی قوت منافع کی قوت ہے۔ اس کو اصطلاحاً محرک منافع (Profit Motive) کہتے ہیں، یعنی معاشی اعمال کی تحریک زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے مقصد سے ہوتی ہے۔ اس مفروضہ کے پس پشت بعض تاریخی عوامل بھی ہیں۔ ایک معاشی نظام کے طور پر سرمایہ داری کا ارتقا اس وقت ہوا جب کہ یوروپ میں انفرادیت (Individualism) نشاط پرستی (Hedonism) افادہ پرستی (Utilitarianism) مادہ پرستی (Matenalism) اور روشن خیالی (Liberalism) کے مختلف النوع اور اکثر متضاد نظریہ رکھنے والے فلسفیانہ مکتبہ ہائے فکر پروان چڑھ رہے تھے، سرمایہ داری کے مختلف پہلوؤں پر ان فلسفوں کا اثر پڑا اور ان کے زیر اثر مختلف قسم کے مفروضے سرمایہ دارانہ معاشیات میں در آئے۔ محرک منافع کے مفروضہ کی تہہ میں یہ خیال کارفرما ہے کہ ہر فرد اپنے مفاد کو بخوبی جانتا ہے اور وہ صرف اس قسم کے اعمال میں دلچسپی رکھتا ہے جس سے اس کا کسی قسم کا مفاد وابستہ ہو۔ ایڈم اسمتھ کا خیال تھا کہ اپنے مفاد کا خیال، انسانی عمل کے لئے بہترین محرک ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنے اپنے مفاد کی نگہبانی کرے اور اس کے لئے کوشاں رہے تو بہ حیثیت مجموعی پورے سماج کا مفاد نہ صرف محفوظ رہے گا بلکہ بیش ترین بھی ہوگا۔ معاشیات کے ضمن میں مفاد کا مفہوم منافع سے لیا گیا۔ جو

پیدا کاروں کے عمل کے لئے تحریک کا باعث ہے لیکن دوسرے طبقات بھی اپنے اپنے مفاد کی نگہداری کرتے ہیں۔ سرمایہ دار کا مفاد اس میں ہے کہ وہ مزدور کو کمترین مزدوری کی شرح دینے کی کوشش کرے، مزدور کا مفاد اس میں ہے کہ وہ بیش ترین مزدوری حاصل کرنے کی کوشش کرے، تاجر طبقہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی اشیاء کے لئے زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کر سکے لیکن خریدار اس کے برعکس کم سے کم قیمت پر اشیاء حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان متضاد مقاصد کے درمیان مفاہمت اور تال میل، بازار کی قوتوں، طلب اور رسد کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے جس کو ایڈم اسمتھ نے غیر مرئی ہاتھوں (Invisible Hands) سے تعبیر کیا ہے گویا کچھ نظر نہ آنے والے ہاتھ ہیں جو ان مخالف اور متصادم قوتوں کے درمیان توازن پیدا کرتے ہیں اور ان سے سماجی فلاح کے وہ کام لیتے ہیں جو ابتداءً ان کا مقصود نہ تھا۔ اس طرح سرمایہ دار اور مزدور دونوں ایک متوازن شرح مزدوری، پر متفق ہو جاتے ہیں کیونکہ اتفاق نہ ہونے کی صورت میں دونوں کا نقصان ہے۔

حکومت کی عدم مداخلت یا کمترین مداخلت

سرمایہ دارانہ معیشت کا کلاسیکی تصور معاشی دائرۂ کار میں حکومت کی عدم مداخلت کے اصول پر قائم تھا۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے اولین فلسفیوں اور پیغامبروں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ نظام اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ اگر ہر شخص اپنے اپنے مفاد کی تحریک سے عمل پذیر ہو تو اس کے ذریعہ بیش ترین سماجی فلاح اپنے آپ ہی حاصل ہو جائے گی۔ اس صورت میں انفرادی فلاح اور سماجی فلاح میں تصادم نہ ہوگا اور آزاد قیمتوں کا نظام تمام معاشی وسائل کی بحسن وخوبی تقسیم اور مختلف اشیاء وخدمات کی کارگذار پیداوار میں کامیاب ہوگا۔ ہر معاشی وسیلہ کو اس کی خدمت کا بیش ترین معاوضہ حاصل ہوگا۔ ہر شے اور خدمت کمترین لاگت پر پیدا کی جائے گی۔ تمام معاشی وسائل بروئے کار لائے جائیں گے، ہر شخص کو روزگار ملے گا، اس صورت حال میں

حکومت کی جانب سے معاشی دائرۂ کار میں مداخلت کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ اگر حکومت کی جانب سے کوئی مداخلت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آزاد قیمتوں کے نظام میں بے ترتیبی اور گڑبڑی پیدا ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ بے ترتیب ہونے کے بعد نظامِ قیمت وہ تمام وظائف بحسن وخوبی انجام نہیں دے سکتا جو اس نظام معیشت کے تحت اسے تفویض کئے گئے ہیں۔ چنانچہ آزاد کاروباری معیشت کی عمدہ ترین کارکردگی کے لئے بہتر یہی ہے کہ حکومت کی مداخلت یا تو بالکل نہ ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کمترین ہو۔ اس پالیسی کو ایک لاطینی لفظ Laissez Faire (یعنی آزاد چھوڑ دو) سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ریاست کو انفرادی معاشی اور تجارتی اعمال میں مداخلت سے احتراز کرنا چاہیے اور بازار میں طلب ورسد کی قوتوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔

آزاد کاروبار کی پالیسی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حکومت کسی بھی قسم کے معاشی کام انجام نہیں دے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت قیمتوں اور مزدوری، شرح سود، شرح لگان وغیرہ پر کسی طرح کا کنٹرول نافذ نہیں کرے گی اور اپنے اعمال کو صرف ان وظائف تک محدود رکھے گی جو ناگزیر سمجھے جاتے ہیں۔ ایڈم اسمتھ نے اپنی کتاب ''دولت اقوام'' میں حکومت کے معاشی افعال واعمال کے لئے مندرجہ ذیل امور کی نشان دہی کی ہے۔

١- آزاد سرمایہ دارانہ معیشت میں حکومت دفاعی ذمہ داریاں سنبھالے گی اور ملک کے دفاع کے لئے انتظام کرے گی، اسی طرح میں ملک میں امن وامان قائم رکھنا اور قانون وانتظام (Law & Order) کی عمل داری کے وظائف کو سرانجام دینے کے لئے بنائے رکھنا بھی حکومت وقت کی ذمہ داری ہے۔ ان تمام وظائف کو انجام دینے کے لئے وسائل کی ضرورت ہوگی تا کہ فوج، پولیس، جیل خانے اور عدالتی نظام قائم کیا جائے اور ان کو جاری رکھا جا سکے، فوج اور پولیس کے لئے ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی۔ حکومت یا تو یہ ہتھیار اور اسلحہ جات خود پیدا کرے گی یا ان کو بازار سے خریدے گی، دونوں صورتوں میں حکومت کو ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے

لئے معاشی وسائل درکار ہوں گے۔ اور ان وسائل کے حصول کی خاطر حکومت کو معیشت میں مداخلت کرنا پڑے گی۔

۲- سرمایہ دارانہ معیشت میں نجی کاروباری زمرہ بہت سی سماجی ضروریات کو پورا نہ کر سکے گا کیونکہ یہ ضروریات کسی ایک فرد کی نہیں ہوتی ہیں بلکہ سارے سماج کی ہوتی ہیں۔ جیسے سڑکوں کی تعمیر، شہر کی سڑکوں پر روشنی اور صفائی کا انتظام، دریاؤں پر پُل اور باندھ کی تعمیر، سیلاب اور دوسری ارضی وسماوی آفات سے بچاؤ کی تدابیر وغیرہ۔ یہ تمام ضروریات سماجی ضروریات ہیں اوران کی تسکین کرنے والی سہولیات کو ہم سماجی اشیاء (Social Goods) کہتے ہیں۔ چونکہ ان اشیاء سے کسی خاص شخص یا کسی خاص علاقے کو فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ سارے سماج، یا سارے علاقے کو فائدہ پہنچتا ہے اس لئے کوئی ایک شخص ان تمام سہولیات کی لاگت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ اہم ضروریات پوری نہ ہوسکیں گی۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری قبول کرے اوران کی فراہمی کی خاطر مناسب معاشی وسائل مہیا کرنے کی کوشش کرے۔

۳- مندرجہ بالا وظائف کے ساتھ ساتھ حکومت کو وہ تمام معاشی اعمال بھی سرانجام دینے چاہیے جو افراد اپنے نجی کاروبار کی وجہ سے نہ کرسکیں یا اتنی مقدار میں نہ کرسکیں جتنی کہ اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو۔ مثلاً یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ تعلیم ضروری چیز ہے اور انسانوں کو امیر وغریب کی تفریق کیے بغیر تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے تو ریاست کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کا بندوبست کرے اوراس مقصد کے حصول کی خاطر عوامی ذرائع سے تعلیم گاہیں قائم کرے۔ اسی طرح اگر کسی چیز کی پیداوار کے لئے نجی سرمایہ دار اس سبب سے کارخانہ نہیں لگا سکتے کہ اس کے لئے جتنی بڑی تعداد میں وسائل کی ضرورت ہے ان کا مہیا کرنا ممکن نہیں ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔

سرمایہ دارانہ معیشت کی خرابیاں

سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات کو جان لینے کے بعد یہ امر ہمارے لئے آسان ہوگیا ہے کہ اس معاشی نظام میں کون کون سی خرابیاں اور کمیاں ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

الف۔ آمدنی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم

سرمایہ دارانہ معیشت میں آمدنی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم پائی جاتی ہے۔ چونکہ ذرائع پیداوار افراد کی نجی ملکیت میں رہ سکتے ہیں اور حق ملکیت پر کسی طرح کی حد عائد نہیں کی جاتی، اس لئے چند افراد یا چند صنعتی گھرانے ملک کی دولت کے بڑے حصے پر قابض ہو جاتے ہیں اور ملک کی اکثریت کے حصے میں نہایت قلیل وسائل آتے ہیں۔ وراثت کے حق کے ذریعہ آمدنی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کو قائم رہنے میں مزید مدد ملتی ہے اور بسا اوقاف اس تفاوت میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

ب۔ اجارہ داریوں کا ظہور

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی مسلمات میں سے ایک مسلّمہ مکمل مسابقت کا وجود ہے۔ یعنی اشیائے پیداوار اور ذرائع پیداوار، دونوں بازاروں میں مکمل مسابقت پائی جاتی ہو۔ لیکن مسابقتی بازار بہت دنوں تک قائم نہیں رہتے۔ تاریخی طور پر یہ ہوتا رہا ہے کہ غیر کارگذار کاروباری ادارے (Inefficient Business) بازار سے ختم ہوتے چلے جاتے ہیں اور صرف کارگذار ادارے ہی باقی رہتے ہیں۔
ان کارگذار اداروں میں سے بہترین اداروں کو زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ وہ

اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں، تکنیکی ترقی کرتے ہیں جس سے ان کی فی اکائی لاگت کم ہوتی جاتی ہے۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے وہ بازار پر حاوی ہوتے جاتے ہیں تا آنکہ وہ اجارہ دار بن جاتے ہیں، مختلف بازاروں میں اجارہ داریوں کے ظہور کے بعد سرمایہ دارانہ معیشت اور نظامِ قیمت کے حق میں دیئے گئے وہ دلائل کمزور پڑ جاتے ہیں جن کی بنیاد مکمل مسابقت پر رکھی گئی ہے۔

ج-سماجی فلاح کا زیاں

سرمایہ دارانہ معیشت کے ناقد اس پہلو پر بہت زور دیتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں بیش ترین سماجی فلاح کا حصول نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے دو سبب بیان کیے جا سکتے ہیں، اول تو اجارہ داری کے باعث اجارہ دار کو معمولی منافع کے بجائے ''خالص اجارہ دارانہ منافع'' (Net Monopoly Profits) حاصل ہوتے ہیں جن سے اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور اجارہ دار استحصال کرنے کی پوزیشن میں آ جاتا ہے، دوم یہ کہ محرک منافع کے باعث نظام قیمت، وسائل کی تقسیم صرف نفع آور کاروباروں میں کرتا ہے اور اس کے لئے سماجی فلاح کی چنداں پرواہ نہیں کی جاتی، اس طرح سماجی نقطۂ نظر سے ضرر رساں معاشی اعمال کی سرپرستی ہو سکتی ہے اگر وہ نفع آور ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے نقاد کہتے ہیں کہ نظام قیمت اور محرک منافع سماج کے وسائل کی صحیح تقسیم نہیں کرتے بلکہ ان کو اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ بہت سی بنیادی ضروریات تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں۔ اور وسائل غیر ضروری تعیشات کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں وسائل کا صحیح اور بھرپور استعمال نہیں ہو پاتا جس سے سماجی فلاح کا زیاں ہوتا ہے۔

د-تجارتی چکروں کا وجود

سرمایہ دارانہ معیشت کی ایک بڑی خرابی تجارتی چکروں کا وجود ہے، تجارتی چکر سے

ہماری مراد معاشی عمل میں متدائرا تار چڑھاؤ (Cyclical Fluctuations in Economic Activity) سے ہے۔ مختلف مما لک میں سرمایہ دارانہ معیشت کا تاریخی مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت کی ترقی ہموار، سطری (Linear) اور یکساں نہیں ہوتی ہے بلکہ مختلف زمانوں میں رفتار ترقی کم اور تیز ہوتی رہتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ کبھی کبھی معاشی پس روی کا رجحان بھی پیدا ہو جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں معیشت، اتار چڑھاؤ کا شکار ہوتی رہتی ہے، کبھی خوش حالی (Prosperity) کا دور آتا ہے اور کبھی بدحالی (Depression) کا۔ خوش حالی کے دور میں روزگار، آمدنی، مانگ، قیمتیں، مزدوری اور دوسرے معاشی اشاریئے (Indicators) تیزی سے اضافہ کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں، لیکن بدحالی کے دور میں مانگ کم ہو جاتی ہے جس سے پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ روزگار کم ہو جاتا ہے اور بے روزگاری میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ آمدنی، منافع، قیمتیں، اور مزدوری بھی گھٹنے لگتی ہیں۔ اس طرح خوش حالی اور بدحالی کے دور پلٹ پلٹ کر آتے رہتے ہیں اور ان کے سہارے ہی سرمایہ دارانہ معیشت ترقی کرتی رہتی ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت اپنی تمام تر تکنیکی ترقیوں اور معاشی پالیسی کے نئے نئے طریقوں کے باوجود بھی، اضافہ قیمت (Inflation) اور بے روزگاری (Unemployment) جیسے سماجی مسائل کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

اشتراکی معیشت

اشتراکی معیشت، سماجی معیشت کی دوسری قسم ہے۔ اس کی امتیازی خاصیت مرکزی منصوبہ بند معیشت (Centrally Planned economy) یا منصوبہ بندی کا قیام ہے۔ اشتراکیت کے فلسفہ کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ سماج میں جائداد کی نجی ملکیت ہونے کے بجائے مشترکہ ملکیت ہونا چاہیے۔ گو کہ فلسفۂ اشتراکیت کی ابتدائی بنیادیں افلاطون کی خیالی ریاست میں تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن سائنسی اشتراکیت کی بنیاد کارل مارکس اور اینگلز کے معاشی افکار کے

ذریعہ پڑی۔ کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کی سائنسی تنقید کی اس کے نزدیک سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ نجی ملکیت اور محرک منافع کے ذریعہ مزدوروں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ مارکسی مکتبہ خیال کے مطابق کسی چیز کی قدر کا تعین صرف محنت سے ہوتا ہے اور جملہ ذرائع پیداوار میں صرف محنت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں قدر کی تخلیق کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پیدا شدہ ذرائع پیداوار مثلاً مشین وغیرہ اس قدر کو صرف منتقل کر سکتے ہیں تخلیق نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا صرف محنت کے لئے ممکن ہے، اس لئے کل پیداوار پر (یعنی وہ قدر جس کی تخلیق دوران پیداوار کی گئی) صرف محنت کا حق ہے۔ لیکن سرمایہ دار، مزدوروں کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ (یعنی کُل پیداوار) نہیں دیتے۔ اس کے برعکس وہ مزدوری کی شکل میں کُل پیداوار کا ایک نہایت قلیل حصہ نکالتے ہیں اور بقیہ منافع کی شکل میں خود رکھ لیتے ہیں۔ مارکس اس منافع کو فاضل قدر کہتا ہے۔ اس کو فاضل قدر اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ یہ قدر کی اس مقدار سے زیادہ ہے جس کی مزدور کو اپنا جان وتن کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے ضرورت ہے، چنانچہ منافع کی شکل میں سرمایہ دار محنت کشوں کا استحصال کرتے ہیں، اور اپنا منافع بیش از بیش کرنے کے لئے محنت کشوں کی مزدوری کی شرح میں کمی کرتے ہیں۔ ان کے اوقاتِ کار میں اضافہ کرتے ہیں، نئی مشینیں لا کر محنت کشوں کی تعداد میں تخفیف کرتے ہیں تا کہ اجرت کے طور پر دی جانے والی کل رقم میں کمی کی جا سکے۔ اس طرح مختلف طریقوں سے سرمایہ دار محنت کشوں کا استحصال کرتے ہیں۔

سرمایہ دار اور محنت کش دو مختلف طبقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جن کے مفادات ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم ہوتے ہیں۔ اس طرح طبقاتی آویزش کی راہ کھل جاتی ہے۔ دوسری جانب سرمایہ داروں کے بیش ترین منافع حاصل کرنے کی تحریک اور زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کرنے کی خواہش کے سبب پیداواری نظام بھی ابتری اور بے نظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مارکس کے خیال میں محنت کشوں کے استحصال کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ محنت کش

طبقہ، سرمایہ دار طبقہ کے خلاف طبقاتی جدوجہد کی راہ اپنائے اور انقلاب کے ذریعہ سرمایہ دار طبقہ کی حکومت کو اکھاڑ پھینکے۔ انقلاب کے بعد اشتراکی معیشت قائم کی جائے گی جس میں معاشی وسائل اور جائداد کی انفرادی ملکیت کا خاتمہ کردیا جائے گا کیونکہ اشتراکی مفکرین کی نظر میں وسائل پیداوار کی انفرادی ملکیت ہی سرمایہ دارانہ نظام کی بے ترتیبی اور خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔

مارکس نے اپنی تحریروں میں اس بات کی چنداں وضاحت نہیں کی کہ ایک اشتراکی معیشت کس طرح کام کرے گی کیونکہ ان کے سامنے اشتراکی معیشت کا کوئی اصل نمونہ موجود نہ تھا۔ مارکس کے عرصۂ حیات میں ساری دنیا میں سرمایہ دارانہ معاشی نظام ہی نافذ تھا، دنیا کی پہلی اشتراکی معیشت روس میں اکتوبر 1917ء کے انقلاب کے بعد قائم ہوئی جس کی نظریاتی بنیادیں کارل مارکس کے سماجی و معاشی فلسفے نے فراہم کی تھیں۔ گوکہ بیسویں صدی میں بہت سی اشتراکی ریاستیں وجود میں آئیں لیکن ان کے درمیان اشتراکیت کی تفصیلات اور اشتراکی فلسفہ کی تعبیرات میں بھی کافی اختلاف پایا جاتا تھا، ایک زمانہ تک سوویت روس اشتراکی ریاست کا ایک مکمل نمونہ رہی، ذیل میں ہم اشتراکی ریاست کا جو تجزیہ کریں گے وہ سوویت روس کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اشتراکی ریاست کے ایک مجرد تصور کی بنیاد پر قائم ہوگا۔

اشتراکی معیشت کے بنیادی خدوخال

اشتراکی معیشت کو سرمایہ دارانہ معیشت سے ممتاز و ممیز کرنے کے لئے ہم یہ فرض کریں گے حکومت منصوبہ بندی کے مقاصد تعین کرتی ہے۔ تمام وسائل پیداوار حکومت کی ملکیت میں ہیں اور مختلف صنعتوں کے درمیان محنت کی تقسیم حکومت کے حکم سے ہوتی ہے، اس قسم کی معیشت میں کسی معیشت کے بنیادی مسائل منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کیے جاتے ہیں مثلاً کن چیزوں کی پیداوار کی جائے، اس کا فیصلہ مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کرتا ہے، صارفین کو اس کا حق

حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی ترجیحات کے ذریعہ پیداوار کی ترجیحات طے کریں، کس طریقے سے پیداوار کی جائے اور پیداوار کس کے لئے کی جائے اس کا فیصلہ بھی حکومت منصوبہ کمیشن کے ذریعہ سے ہی کرے گی، اشتراکی معیشت کے بنیادی خدوخال مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- وسائل پیداوار کی سماجی ملکیت

سرمایہ دارانہ نظام میں ذرائع پیداوار کی ملکیت انفرادی ہوتی ہے لیکن اشتراکی معیشت میں کسی فرد کو ذرائع پیداوار کا مالک بننے کا حق نہیں ہوتا۔ بلکہ تمام ذرائع پیداوار پورے سماج کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں، چونکہ حکومت سماج کا سب منظم نمائندہ ہے اس لئے وسائل پیداوار حکومت کے زیرنگرانی ہی رہتے ہیں۔ اس طرح تمام کارخانوں، کھیتوں اور پیداواری اکائیوں پر کسی نہ کسی قسم کا اجتماعی کنٹرول ہوتا ہے، اشتراکی معیشت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ پیداواری اکائی پر براہِ راست حکومت کا ہی کنٹرول ہو۔ اجتماعی ملکیت کی دوسری شکلیں، مثلاً امداد باہمی اور اجتماعی کمیٹی وغیرہ بھی بعض اشتراکی ممالک میں رائج ہیں۔ لیکن کسی فرد کو بذات خود ذرائع پیداوار کا مالک بننے کا حق اشتراکی معیشت میں نہیں ہوتا۔

۲- منافع کے بجائے سماجی فلاح کے لئے پیداوار

سرمایہ دارانہ نظام میں منافع حاصل کرنے کے لئے پیداوار کی جاتی ہے۔ اس طرح پیداوار کا محرک ہی منافع ہے، اشتراکی معیشت میں چونکہ وسائل پیداوار پورے سماج کی ملکیت ہوتے یں اس لئے اس معاشی نظام میں پیداوار کا مقصد منافع حاصل کرنے کے بجائے سماجی فلاح کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ضمن میں ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ اس طرز معیشت میں ہر اس چیز کی پیداوار کی جائے گی جس میں منافع کمانے کا امکان ہو۔ لیکن اشتراکی

معیشت میں ایسا نہیں ہوگا اور صرف انھیں اشیاء کی پیداوار کی جائے گی جن کی پیداوار کو سماجی نقطۂ نظر سے ضروری سمجھا جائے۔ مثلاً یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف قسم کے سامان تعیش مثلاً رنگین ٹیلی ویژن یا ریفریجریٹر یا دوسری اشیائے صرف کی پیداوار کم کی جائے یا بالکل نہ کی جائے کیونکہ منصوبہ بندی کمیشن کا خیال یہ ہے کہ ملک کو اپنی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لئے بھاری مشینوں کا کارخانہ لگانا چاہیے یا فولاد اور سمینٹ کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنا چاہیے وغیرہ، مختصر یہ کہ تمام معاشی فیصلوں کی بنیاد، انفرادی منافع کے بجائے سماجی فلاح و بہبود پر ہوتی ہے۔

۳-مرکزی معاشی منصوبہ بندی

سرمایہ دارانہ نظام میں تو تمام معاشی فیصلے لامرکزی (Decentralized) ہوتے ہیں کیونکہ یہ افراد کے ذریعے کیے جاتے ہیں، اشتراکی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نظام میں معاشی فیصلوں کی مرکزیت ہوتی ہے، اس مقصد کے لئے ملک میں ایک مرکزی منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا جاتا ہے، (اس کو مرکزی کہنا اس لئے ضروری ہے کہ ایک ہی ملک میں مختلف علاقوں میں علاقائی منصوبہ بندی کمیشن بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ان کا دائرۂ عمل محدود ہوتا ہے اور ان کے تمام فیصلے مرکزی منصوبہ کمیشن کے فیصلوں کے تابع رہتے ہیں) مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کا خاص کام ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے منصوبہ تیار کرنا ہوتا ہے، یہ منصوبے کسی خاص مدت کے لئے تیار کیے جاتے ہیں، جیسے پنجسالہ منصوبہ، سات سالہ منصوبہ، دس سالہ منصوبہ یا بیس سالہ منصوبہ، منصوبہ ایک ایسی معاشی دستاویز ہے جس کے ذریعہ اشتراکی ریاست کی معاشی زندگی میں ترتیب اور نظم وضبط پیدا کیا جاتا ہے۔

ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں قلیل وسائل کی تقسیم کا کام نظام قیمت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اشتراکی معیشت میں یہی کام منصوبہ بندی کے ذریعہ سرانجام پاتا ہے۔

ہر منصوبہ کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں، مثلاً تیز رفتار معاشی ترقی، صنعت کا پھیلاؤ۔ درآمد میں کمی، برآمد کا فروغ وغیرہ۔ ان مقاصد کا تعین حکومت کرتی ہے۔ منصوبہ بندی کے ماہرین ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص حکمت عملی وضع کرتے ہیں جس کے ذریعہ ان اعلان شدہ مقاصد کو حاصل کیا جاسکے۔ ان تمام مقاصد کو ٹھوس نشانوں (Targets) میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ پوری معیشت کے لئے پھر ہر زمرے کے لئے، بعد میں ہر صنعت، اور ہر صنعتی اکائی کے لئے الگ الگ نشانے مقرر کئے جاتے ہیں۔ ان نشانوں کو حاصل کرنے کے لئے مختلف زمروں اور صنعتوں میں وسائل وقف کیے جاتے ہیں، اس طرح منصوبے کے ذریعہ یہ اہم معاشی مسائل کہ کن چیزوں کی پیداوار کی جائے اور کس طرح کی جائے طے کیے جاتے ہیں، پیداوار کی تقسیم کا مسئلہ بھی منصوبے کے اندر ہی طے ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہی یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ کتنے مزید لوگوں کو اس منصوبہ میں روزگار فراہم کیا جائے گا اور ان کی اجرتوں اور آمدنیوں کی سطح کیا ہوگی۔ اس طرح اشتراکی معیشت کا مرکزی معاشی منصوبہ ملک کی پوری معاشی زندگی اور اس کے مختلف جہتوں کا احاطہ کرتا ہے، منصوبہ بندی کو اشتراکی طرز زندگی میں واقعی ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

۴- معاشی مساوات

سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بڑی خرابی دولت اور آمدنی کی تقسیم میں عدم مساوات کی موجودگی ہے۔ اس عدم مساوات کا سب سے بڑا سبب ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ہے۔ اشتراکی معیشت میں ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہے اس لئے آمدنی اور دولت میں نابرابری کا ایک بڑا سبب ختم ہوجاتا ہے، اجتماعی ملکیت کے سبب اگر آمدنی کی نابرابری کا مکمل خاتمہ نہیں ہوجاتا تو بھی اس میں بڑی حد تک مساوات لے آئی جاتی ہے۔ اشتراکی معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح یہ ناہمواری نہیں پائی جاتی کہ معاشی طاقت کا ارتکاز صرف چند ہاتھوں یا

چند گھرانوں میں ہو۔ چند افراد کروڑ پتی اور ارب پتی ہوں لیکن لاکھوں دوسرے افراد غربت اور محرومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیئے جائیں۔ اشتراکی طرز معیشت، سماج کے ہر فرد کو ایک کم از کم معیار زندگی حاصل کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ ہر اس شخص کو روزگار فراہم کرنے کی ذمہ داری ریاست اپنے سر لیتی ہے جو کام کرنے کے لائق ہے اور کام کرنا چاہتا ہے، سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح اشتراکی معیشت میں بے روزگاروں کی فوج نہیں بنتی۔ چونکہ ہر شخص کو روزگار فراہم کیا جاتا ہے اس لئے وہ آمدنی بھی حاصل کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی اور اپنے کنبہ یا دوسرے لوگوں کی جو اپنی ضروریات کے لئے اس پر منحصر ہوں، کفالت کر سکتا ہے۔ ریاست ایک لاتعلق تماش بین کا رول اپنانے کے بجائے ایک مربیانہ اور فلاحی نقطۂ نظر اپناتی ہے۔ ریاست ہر اس شخص کی کفالت کا ذمہ لیتی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنی روزی کمانے کے لائق نہیں ہے۔ اس طرح چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور معذور لوگوں کی دیکھ بھال ریاست خود کرتی ہے۔

اشتراکی معیشت کے سلسلے میں معاشی مساوات کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اس طرح کے معاشی نظام میں مکمل معاشی مساوات نہیں ہوتی۔ یہ فرض کر لینا غلط ہوگا کہ اشتراکی نظام میں ایک صنعتی مزدور اور ایک ایٹمی سائنس داں کو یکساں تنخواہ ملتی ہوگی۔ صنعتی مزدور اور ایٹمی سائنس داں الگ الگ کام کرتے ہیں۔ ان کے کاموں کی نوعیت مختلف ہے۔ ان کاموں کو کرنے کے لئے جس لیاقت اور تربیت کی ضرورت ہے وہ بھی مختلف ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کو اپنی اپنی لیاقت اور کارکردگی کے اعتبار سے تنخواہ دی جائے گی اور اس میں کسی مصنوعی یکسانیت اور برابری کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ان کی آمدنیوں میں کسی مصنوعی طریقے سے مکمل برابری پیدا کر دی بھی جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ بات معاشی منطق اور عقل سلیم کے خلاف ہوگی بلکہ اس کے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔ کیونکہ ہر وہ شخص جو زیادہ پیچیدہ اور مشکل کام کرتا ہے اور جس کو اس کی اہلیت اور لیاقت کی مناسبت سے معاوضہ نہیں دیا جا رہا ہے، کام میں دلچسپی لینا چھوڑ

دے گا، اس کی پیدا آوری گھٹتی جائے گی اور بالآخر اس سے قومی پیداوار کا نقصان ہوگا۔ اس طرح مصنوعی برابری بجائے سودمند ثابت ہونے کے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس لئے معاشی نظام کے چلانے والوں کے لئے اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ فطرت نے انسانوں کو یکساں نہیں پیدا کیا بلکہ ان کی جسمانی اور ذہنی قوتوں میں تفاوت اور نابرابری پیدا کی ہے، معاشی مساوات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی فطری مناسبت، رجحان اور لیاقت کے لحاظ سے اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی شخصیت کا پورا ارتقا کر سکے، اور اس عمل کے دوران سماجی فلاح میں بھی اضافہ کرے۔

۵- معاشی نمو اور معاشی ترقی

اشتراکی معیشت میں مرکزی معاشی منصوبہ بندی کا عام طور پر مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک کو معاشی نمو اور معاشی ترقی کی راہ پر گامزن کیا جائے۔ اشتراکی معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح معاشی اتار چڑھاؤ نہیں ہوتے کیونکہ مانگ اور فراہمی کی قوتیں آزاد نہ ہو کر منصوبہ کے تابع رہتی ہیں، منصوبہ بندی کے ماہرین معیشت کے مستقبل کے لئے ایک راہ متعین کرتے ہیں اور ایسی حکمت عملی وضع کرتے ہیں کہ معیشت اسی راہ پر گامزن رہے۔ اس لئے آئندہ برسوں میں معیشت کی رفتارِ ترقی کی شرح کیا ہوگی۔ اس شرح کو حاصل کرنے کے لئے کل کتنی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی۔ یہ سرمایہ کاری مختلف صنعتوں کے درمیان کس طرح منقسم ہوگی۔ ان تمام سوالوں کا جواب منصوبہ میں رہتا ہے۔ اس لئے معاشی ترقی۔ بجائے آزادانہ پھوہڑ پن کے منصوبہ بند طریقہ سے ہوتی رہتی ہے۔

معاشی ترقی کے سلسلے میں اشتراکی معیشت کو منصوبہ بندی سے ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ معیشت کی ترقی ناہموار طریقے سے نہیں بلکہ متوازن طریقے سے ہوتی ہے۔ مختلف

زمروں اور مختلف علاقوں کے درمیان کسی طرح عدم توازن (Imbalance) نہیں رہتا۔ اگر کچھ عدم توازن رہتا بھی ہے تو اس کی حیثیت منصوبہ بند عدم توازن (Planned Imbalance) کی ہوتی ہے جس کو کسی آئندہ منصوبہ میں مناسب پالیسی اختیار کر کے آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے۔

۵-اشتراکی معیشت میں انفرادی آزادی

بعض ماہرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے اشتراکی معیشت میں انفرادی آزادی اور بالخصوص انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) کی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔ اگر اشتراکی معیشت کا معروضی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس نظام معیشت میں بھی انتخاب کی آزادی موجود ہے لیکن فرق یہ ہے کہ انتخاب کی آزادی، مطلق ہونے کے بجائے محدود ہوتی ہے اور ہنگامی حالات کی صورت میں ہمیشہ سماجی مصالح کے تابع رہتی ہے۔ اشتراکی معیشت کا ایک اصول یہ ہے کہ ایسے تمام فیصلے، جن کا اثر دوسرے افراد پر پڑتا ہو، اجتماعی طور پر کیے جانے چاہیے تاکہ دوسرے افراد کے مفادات کا تحفظ ہو سکے اور کوئی ایک فرد، دوسرے افراد کو ان کے جائز حقوق سے محروم نہ کر دے، چنانچہ اس اصول کے تحت کسی فرد کو دوسرے فرد کے معاشی استحصال کی آزادی نہیں ہے، وہ خود محنت کر سکتا ہے لیکن کسی دوسرے فرد کی محنت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ معاشی استحصال کے خاتمہ کی خاطر ہی وسائل پیداوار اجتماعی ملکیت میں رکھے جاتے ہیں تاکہ سماج کا ہر فرد و بشر ان کی برکات سے متمتع ہو سکے اور کوئی بھی محروم نہ رہے۔

مثال کے طور پر صرف کے انتخاب کی آزادی (Freedom to Choose Consumption) کو ہی لیجئے۔ اشتراکی معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح صارفین کو حاکمیت تو حاصل نہیں ہے لیکن پیدا شدہ اشیائے صرف میں سے کن اشیاء کا اور کتنی مقدار میں

انتخاب کریں، یہ حق صارفین کو حاصل ہے۔ لیکن کن چیزوں کی پیداوار کی جائے۔ اس کا تعین صارفین کی ترجیحات سے ہونے کے بجائے منصوبہ کے مقاصد سے ہوتا ہے۔ اس طرح انتخاب کا حق محدود ہے کہ وہ صرف مہیا شدہ اور پیدا شدہ اشیاء میں سے ہی انتخاب کر سکتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر اس حق کو بھی سلب کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جنگ کے زمانہ میں مکمل راشننگ نافذ کر دی جائے اور صارفین کو اس بات کا حکم دیا جائے کہ وہ صرف فلاں فلاں اشیاء مقررہ مقدار میں استعمال کریں۔ (لیکن زمانۂ جنگ میں ایسا تو سرمایہ دارانہ ممالک میں بھی کیا جاتا ہے)۔ اسی طرح افراد اپنی آمدنی میں سے کتنا صرف کریں اور کتنی بچت کریں۔ اس کا حق بھی انھیں ہے۔ لیکن وہ اپنی بچت کو صرف اپنے اوپر خرچ کر سکتے ہیں، اس سے مزید آمدنی حاصل کرنے کے لئے سرمایہ کاری نہیں کر سکتے۔ اس طرح ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اشتراکی معیشت میں انفرادی آزادی تو ہے لیکن وہ مطلق ہونے کے بجائے محدود ہے۔

مخلوط معیشت (Mixed Economy)

ایک معاشی نظام کے طور پر مخلوط معیشت، سرمایہ دارانہ معیشت اور اشتراکی معیشت کے انتہا پسندانہ راستوں کے مقابلہ میں ایک درمیانہ راہ ہے۔ ایک مخلوط معیشت میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی، دونوں طرح کی معیشتوں کی کچھ نہ کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ نظری طور پر ایک مخلوط معیشت کی تعریف کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ خصوصیات کس تناسب سے ملائی گئی ہیں، اس کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی معروضی معیار مقرر نہیں ہے، یہ عین ممکن ہے کہ کسی معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کی صفات حاوی ہوں اور اشتراکی معیشت کی صفات نسبتاً کم ہوں۔ لیکن یہ مخلوط معیشت کہلائے گی، دوسری جانب یہ بھی ممکن ہے کہ کسی معیشت میں اشتراکی معیشت کی صفات غالب ہوں اور سرمایہ دارانہ معیشت کی صفات نسبتاً کم ہوں۔ لیکن ان دونوں قسم کی مخلوط معیشتوں کے درمیان تمیز و امتیاز دوسرے معیاروں کی بناء پر کیا جا سکے تو وہ

دوسری بات ہے ورنہ دونوں مخلوط معیشت کہلانے کی مستحق ہیں۔ اس طرح صرف مخلوط معیشت کہہ دینے سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کس نظام کی خصوصیات اس معیشت میں ممتاز ہیں اور یہ معیشت کس اعتبار سے کام کرتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ امریکہ اور چین کی معیشتیں بھی کسی نہ کسی حد تک مخلوط قرار دی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ یہ معیشتیں بھی درسی کتابون کے معاشی نمونوں (Models) کی طرح جامع نہیں ہیں بلکہ تغیر پذیر، متحرک، نامیاتی اکائیاں ہیں جن میں ارتقائی عمل مسلسل جاری ہے۔ اس لئے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ امریکی معیشت میں بہت سی ایسی خصوصیات شامل ہوگئی ہیں جو'' خالص سرمایہ دارانہ نمونہ''(Pure Capitalist Model) سے میل نہیں کھاتیں بلکہ اشتراکی نظام کا خاصہ ہیں۔ اسی طرح اشتراکی معیشت بھی معاشی دباؤ اور تجربہ کی روشنی میں بعض ایسی چھوٹیں دینے پر مجبور ہوئی ہے جن کا رابطہ اشتراکیت کے کلاسیکی فلسفہ سے کم ہی ہے، ان رجحانات کے پیش نظر نوبل انعام یافتہ سویڈش ماہر معاشیات جان ٹن برجن نے تو یہاں تک پیش گوئی کردی ہے کہ اگر اشتراکی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام اسی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھتے رہے تو مستقبل میں یہ دونوں نظام ایک دوسرے میں ضم ہوجائیں گے۔ ان کا یہ نظریہ'' نظریۂ انضمام''(Convergence Theory) کے نام سے مشہور ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا مباحث اور اس حقیقت سے قطع نظر کہ مخلوط معیشت کی ایک صحیح، جامع اور علمی تعریف کی راہ میں بہت سی منطقی دشواریاں حائل ہیں، ہم ذیل مخلوط معیشت کی صرف وہ خصوصیات بیان کریں گے جو ان ممالک میں عام طور پر پائی جاتی ہیں جنھوں نے اس طرز معیشت کو اپنا رکھا ہے۔

مخلوط معیشت کے بنیادی خدوخال

مخلوط معیشت کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

ا- حق ملکیت کا محدود ہونا

زیادہ تر ممالک میں جہاں مخلوط معاشی نظام رائج ہے، سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح جائداد کی نجی ملکیت کا بھی حق ہے۔ افراد کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کے مالک بنیں، اور اپنے وسائل کو کام میں لا کر اپنی دولت میں مزید اضافہ کریں، لیکن مخلوط معیشت میں یہ حق لامحدود اور مطلق نہیں ہے۔ حکومت اس بات کا حق محفوظ رکھتی ہے کہ عوامی مفاد کی خاطر وہ نجی ملکیت کو قومی ملکیت میں لے لے۔ بعض ممالک میں خاص طور پر ان ممالک میں جہاں زراعت پر آبادی کا زیادہ دباؤ ہے، ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ زرعی زمینوں کی حق ملکیت کو محدود کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص مقررہ مقدار سے زیادہ زمین نہیں رکھ سکتا۔ موجودہ زمانے میں بہت سے ممالک میں اس طرح کی زرعی اصلاحات کی جارہی ہیں اور زرعی قابل کاشت زمینوں کی ملکیت یا خرید و فروخت کے معاملہ کو بازار کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے حکومتوں کے ذریعہ حق ملکیت پر حد مقرر کرنے کی تجویز کافی عرصے سے زیر بحث رہی ہے گو کہ اب تک ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ریاست ایسا کرنا چاہے تو اسے اس بات کا حق ہے۔

۲- نجی اور عوامی زمرۂ کار کا امتزاج

سرمایہ دارانہ معیشت میں اگر تقریباً سارا کاروبار نہ سہی، تو اس کا ایک بہت بڑا حصہ نجی زمرہ میں ہوتا ہے، دفاعی اور اسی نوعیت کی دوسری معاشی سرگرمیاں جو حکومت سرانجام دیتی ہے استثنائی امور میں شامل کیے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ایک معاشی نظام کے طور پر سرمایہ داری کے لئے نجی زمرۂ کار ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری جانب اشتراکی معیشت میں ساری معاشی سرگرمیاں عوامی زمرہ میں ہوتی ہیں اور نجی زمرہ کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی، بالفرض محال، اگر افراد کو ان کی نجی حیثیت میں کسی پیداواری سرگرمی کی اجازت بھی دی جاتی ہے تو

ان کو کسی نہ کسی اجتماعی شکل میں منظم کر دیا جاتا ہے۔ مخلوط معیشت کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس طرز معیشت میں نجی اور عوامی زمرہ ہائے کار شانہ بہ شانہ کام کرتے ہیں۔ عوامی زمرۂ کار کا مفہوم ان معاشی سرگرمیوں سے ہے جن کی پیداواری اکائیاں، نجی ملکیت میں نہ ہو کر عوامی ملکیت میں ہوں۔ اس کی سب سے غالب شکل یہ ہے کہ حکومت ان اداروں کی ملکیت رکھتی ہو اور اپنے تنخواہ دار ملازمین سے ان کا انصرام کراتی ہو۔ عوامی زمرے کے وجود کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت اپنے آپ کو کلاسیکی ذمہ داریوں مثلاً دفاع، زری انصرام (Monetery Manegement) اور شہری سہولتوں (Civil Amenities) تک محدود رکھے۔ عوامی زمرہ کے وجود کا جواز یہ ہے کہ حکومت ایسی تمام صنعتوں کو اپنی تحویل میں رکھے جن کے لئے ایسا کرنا سماجی یا قومی نقطۂ نگاہ سے ضروری ہو۔ یا بالفاظ دیگر جن سے سماجی فلاح کو فروغ ہو۔ ریاست کو وہ ضروری صنعتیں بھی عوامی زمرہ میں قائم کرنا چاہیے جن کے لئے نجی سرمایہ دار وسائل نہ مہیا کر سکیں۔

عوامی زمرہ کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ معاشی زندگی میں حکومت کی مداخلت میں اضافہ ہو۔ اس نظام میں حکومت اپنے آپ کو صرف امن وامان قائم رکھنے، انصاف دلانے، یا ملک کا دفاع کرنے تک ہی محدود نہیں رکھتی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر پیداآوری سرگرمیوں میں شریک ہوتی ہے۔ عام طور پر عوامی زمرے میں ایسی صنعتیں رکھی جاتی ہیں جو بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جیسے بھاری انجینئرنگ کا سامان، لوہا اور فولاد، سیمنٹ، تیل صاف کرنے کے کارخانے، ہوائی جہاز بنانے کا کارخانہ وغیرہ، بعض مالیاتی ادارے بھی عوامی زمرۂ کار میں شامل ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی مخلوط معیشت قائم ہے۔ چنانچہ مخلوط معیشت کے فلسفہ سے ہم آہنگی رکھتے ہوئے مندرجہ بالا بنیادی اور کلیدی اہمیت کے کارخانے عوامی زمرہ میں ہی شامل ہیں، نہ صرف یہ بلکہ حکومت نے بعض ایسی کمپنیاں بھی بنائی ہیں جن کی ملکیت اس کے پاس ہے، جیسے

آئل انڈیا۔ انجینئرنگ انڈیا لمیٹڈ، بھارت ہیوی الیکٹریکلس وغیرہ، ہندوستان میں تو عوامی زمرۂ کار نے اپنے آپ کو صرف بھاری اور کلیدی صنعتوں تک محدود نہ رکھ کر اشیائے صرف کی پیداوار میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ عوامی زمرے کے کارخانوں میں گھڑیوں، ڈبل روٹی، ٹھنڈے مشروبات اور دودھ جیسی روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی پیداوار بھی ہونے لگی ہے۔

نجی زمرے میں جو کمپنیاں ہوتی ہیں ان کا منافع ان کمپنیوں کو جاتا ہے، لیکن عوامی زمرے میں جو کمپنیاں ہوتی ہیں ان کا منافع حکومت کو ملتا ہے اور وہ اس منافع کی سرمایہ کاری کے لئے پروگرام وضع کرتی ہے۔

۳- ریاست کے فلاحی وظائف

مخلوط معیشت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ریاست بہت سے فلاحی وظائف انجام دیتی ہے، بہت سی ایسی ضروریات ہیں جن کی تکمیل نظام قیمت کے ذریعہ ہوسکتی ہے مثلاً تعلیم اور طبی سہولتیں، لیکن قیمتوں کا نظام اس بات کی ضمانت نہیں دے پاتا کہ ان خدمات کی پیداوار اتنی مقدار میں ہوسکے جتنی کہ ضرورت ہے، چنانچہ ریاست اس بات کی ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ ان خدمات کے مہیا کرنے کے لئے اپنے وسائل وقف کرے اور ہر شخص کو ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے مواقع بہم پہنچائے۔ اسی نقطۂ نظر کے پیش نظر حکومتیں اسکول، کالج، یونیوسٹیاں اور اسپتال قائم کرتی ہیں کہ جو لوگ اپنے ذرائع سے تعلیم اور طبی دیکھ بھال جیسی خدمات نہیں خرید سکتے ان کو یہ ریاست کی جانب سے مفت مہیا کی جائے۔ (خیال رہے کہ معاشیات کے نقطۂ نظر سے کوئی معاشی شے یا خدمت مفت نہیں ہوسکتی۔ فرق صرف اس بات کا ہے کہ اس کی قیمت کوئی اور ادا کرتا ہے۔ اس مثال میں قیمت حکومت کی طرف سے ادا کی جاتی ہے)۔ اسی طرح حکومت مختلف ایسے گروہوں کی دیکھ ریکھ بھی اپنے ذمہ لیتی ہے جو معاشی طور پر خود کفیل نہ ہوں۔ مثلاً چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے مخصوص مراکز قائم کرنا، معذور افراد کی

مدد کرنا، غریب طالب علموں کو تعلیمی وظائف دینا، ضعیفوں کو بڑھاپے کی پنشن دینا، بے کار لوگوں کو بونس دینا وغیرہ ان وظائف میں شامل ہیں۔

۴- آزاد کاروبار پر پابندیاں اور اجارہ داری کا کنٹرول

مخلوط معیشت میں عام طور پر کاروبار کی آزادی دی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت آزاد کاروبار پر مختلف قسم کی پابندیاں بھی عائد کرتی ہے تاکہ نجی کاروبار سماجی مقاصد کو بھی پورا کر سکیں۔ حکومت کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ بازار میں مسابقت کا خاتمہ نہ ہو جائے اور اجارہ داریوں کا ظہور ہو، جہاں کہیں اجارہ داریاں ظہور میں آجاتی ہیں حکومت ایسے قانون بنانے کی کوشش کرتی ہے کہ اجارہ دار اپنی پوزیشن کا غلط فائدہ نہ اٹھانے پائیں۔

۵- جمہوری منصوبہ بندی

گو کہ منصوبہ بندی مخلوط معیشتوں کی ایک لازمی خصوصیت نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے ممالک نے جن میں ترقی پذیر ممالک ممتاز ہیں، منصوبہ بند ترقی کی راہ کو اپنا لیا ہے۔ یہ منصوبہ بندی، سوشلسٹ ممالک کی مرکزی منصوبہ بندی سے قدرے مختلف ہوتی ہے کیونکہ اشتراکی ممالک کی منصوب بندی میں جبر (Coercion) کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اس کے برعکس مخلوط معیشتوں کی منصوبہ بندی جمہوری انداز کی ہوتی ہے اور منصوبہ کو صرف مشیرانہ (Advisory) حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

ہندوستان کا معاشی نظام

آئیے اب ہم ان اصولوں کی روشنی میں اپنے ملک ہندوستان کے معاشی نظام کا جائزہ لیں، آپ یہ بات جانتے ہی ہوں گے، اور ہم بھی پچھلے صفحات میں کہیں اس کا تذکرہ کر چکے ہیں

کہ ہندوستان کا معاشی نظام بنیادی طور پر ایک مخلوط معیشت ہے جس میں سرمایہ دارانہ اور اشتراکی، دونوں قسم کے نظام ہائے معیشت کی خصوصیات کا امتزاج ہے، ذیل میں ہم ان خصوصیات کا قدرے تفصیلی جائزہ لیں گے:

۱- ہندوستان کا آئین ہر فرد کو نجی جائداد رکھنے کی آزادی دیتا ہے۔ اب تک اس پر کسی قسم کی حدود نہیں عائد کی گئیں۔ ہر فرد کو اپنی جائداد کو استعمال کرنے، کاروبار کرنے، جائداد خریدنے اور بیچنے کا بھی حق حاصل ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری معیشت کا ایک بڑا حصہ نجی زمرۂ کار پر مشتمل ہے۔ اس نجی زمرۂ کار میں زراعت اور صنعت کا ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ خدمات کے زمرے میں بھی نجی زمرۂ کا خاصا بڑا حصہ ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ خصوصیت سرمایہ دارانہ نظام کی ہے۔

۲- سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ہماری معیشت میں بھی قیمتوں کے نظام کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے، اور نجی زمرۂ کار کے لئے محدود معاشی وسائل کی تقسیم نظامِ قیمت کے ذریعہ ہی ہوتی ہے، نجی زمرۂ کار جس میں زراعت اور صنعت کا ایک بڑا حصہ شامل ہے، پیداوار کیسے کی جائے، کتنی مقدار میں کی جائے اور کس طرح کی تکنیک استعمال کی جائے یہ تمام فیصلے محرکِ منافع کی بنیاد پر نظام قیمت کے ذریعہ ہوتے ہیں۔

۳- ہندوستانی نظامِ معیشت میں، افراد کو صارفین کی حاکمیت حاصل ہے۔ وہ کن اشیاء کا صرف کریں، کتنی آمدنی صرف کریں، کتنی بچت کریں، اس بچت کی سرمایہ کاری کس طرح کریں، یہ سارے فیصلے افراد خود کرتے ہیں، یہ خصوصیت بھی سرمایہ دارانہ نظام سے لی گئی ہے۔

۴- سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح ہندوستان کی مخلوط معیشت میں افراد کو پیشوں کے انتخاب کی آزادی ہے۔ اشتراکی معیشت کی طرح یہاں پیشوں کا انتخاب ریاست نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس افراد پر یہ فیصلہ مبنی ہے کہ وہ کام کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر وہ کام کرنا چاہتے

ہیں تو کس طرح کا کام کرنا چاہتے ہیں اور کون سا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

۵- ابھی چند برس پہلے تک ہندوستانی معیشت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ نجی زمرۂ کار کی کارکردگی پر حکومت کا کافی حد تک کنٹرول ہے۔ صنعتی اداروں اور صنعت کاروں کو صنعت شروع کرنے سے پہلے حکومت سے لائسنس کی شکل میں اجازت لینی پڑتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ کسی نئی چیز کی پیداوار بھی حکومت سے اجازت لئے بغیر شروع نہیں کرسکتے، نہ ہی اپنے پرانے کارخانے/کارخانوں کی پیداواری صلاحیت میں کوئی قابل لحاظ اضافہ کرسکتے تھے، حکومت کی منظوری کے بغیر وہ غیر ممالک سے کسی قسم کی مشینری بھی درآمد نہیں کرسکتے۔ معاشی اصلاحات کے زمانہ میں لائسنس کی شرط ختم کردی گئی ہے۔

اس قسم کے براہِ راست کنٹرول کے علاوہ حکومت معاشی سرگرمیوں میں مختلف بالواسطہ طریقوں سے بھی دخل دیتی ہے، مثلاً کسانوں کو امداد دینا، ان کو رعایتی داموں پر بیج، کھاد اور کیمیاوی کمادیں مہیا کرنا، کسانوں اور معاشی طور پر کمزور طبقات کو کم شرح سود پر قرضے دلوانا۔ مختلف صنعتوں کو مالی اور تکنیکی امداد دینا، وغیرہ۔

۶- ہندوستانی معیشت میں سوشلسٹ نظام کا سب سے بڑا عنصر مرکزی منصوبہ بندی کا قیام ہے۔ اشتراکی ملکوں کی طرح یہاں بھی ایک مرکزی منصوبہ بندی کمیشن قائم ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کا کام یہ ہے کہ وہ ملک کی ترقی کے لئے وقتاً فوقتاً طویل مدتی اور اوسط مدتی منصوبے تیار کرے منصوبہ بندی کمیشن ملک کی معاشی صورت حال اور ملک میں ہونے والی معاشی تبدیلیوں کے متعلق معاشی تحقیقات کا کام بھی انجام دیتا ہے، ہمارے ملک میں معاشی پالیسی طے کرنے کا سب سے بڑا ادارہ قومی ترقیاتی کونسل (National Development Council) ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن منصوبہ تیار کرنے کے بعد قومی ترقیاتی کونسل کو پیش کرتا ہے جو اسے منظور کرتی ہے۔

منصوبہ نجی اور عوامی دونوں زمرہ ہائے کار کے لئے تیار کیا جاتا ہے، لیکن نجی زمرۂ کار

کے لئے صرف نشانے (Target) مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے کوئی مشینری مقرر نہیں ہے۔ عوامی زمرۂ کار کے لئے جو منصوبے تیار کیے جاتے ہیں ان کو مختلف پروجیکٹوں میں تقسیم کر کے، متعلقہ وزارتوں اور ریاستی حکومتوں کو بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہ ان پر عمل درآمد کرائیں۔

ہندوستانی منصوبہ بندی اور اشتراکی منصوبہ بندی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں منصوبہ ملک کی پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا ہے جو اس کو منظور کر کے ایک قانون (Act) کی شکل دے دیتی ہے چنانچہ اگر کسی فرم کا منیجر اس کے کارخانے کے لئے مقرر کردہ نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اس کو قانون کے تحت سزا دی جاسکتی ہے، اس کے ذریعہ منصوبہ بندی میں جبر کا عنصر داخل ہو جاتا ہے، ہمارے ملک میں منصوبہ بندی قطعی طور پر رضا کارانہ اور مشیرانہ ہے۔ اور اس کو قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہے، دوسرے یہ کہ اشتراکی ممالک میں تمام معاشی تغیرات (Economic Variable) جیسے سرمایہ کاری، آمدنی، بچت، صرف، شرح مزدوری، قیمتیں وغیرہ حکومت کے کنٹرول میں ہوتے ہیں، ہماری حیثیت میں ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس بہت سے معاشی تغیرے آزاد ہیں اور نجی زمرے کو قومی معیشت میں ایک اہم رول دیا گیا ہے۔

۷- ہندوستانی معیشت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں آزاد قیمتوں کے نظام کے ساتھ ساتھ کنٹرول شدہ قیمتوں کا ایک نظام بھی کام کرتا ہے، زیادہ تر اشیاء کی قیمتیں تو کھلے بازار میں طلب اور رسد کے ذریعہ متعین ہوتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ بعض اہم اشیائے صرف کی قیمتیں حکومت مقرر کرتی ہے۔ مثلاً کم داموں پر غلہ فراہم کرنے کے لئے سستے غلے کی دوکانیں حکومت کی طرف سے چلائی جاتی ہے۔ حکومت بعض اہم تعمیراتی اشیاء مثلاً سیمنٹ اور فولاد وغیرہ کی قیمتیں بھی مقرر کرتی ہے، اس کے علاوہ عوامی زمرے میں پیدا ہونے والی اشیاء کی قیمتوں کا تعین کرنا تو حکومت کی ذمہ داری میں شامل ہی ہے۔

اسلامی معاشیات

ایک تعارف

اسلامی معاشیات، علم معاشیات کی ایک واضح، متبادل اور ممتاز شاخ کے طور پر تیزی سے درجۂ استناد حاصل کرتی جارہی ہے۔ حالیہ برسوں میں بعض مسلم ممالک نے اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی معاشی نظام کے قیام کو اپنی ریاستی پالیسی کا حصہ قرار دیا ہے، اس کے ساتھ ہی کچھ دوسرے متعلق میدانوں میں بھی اہم تبدیلیاں ظاہر ہوئی ہیں۔ مختلف مسلم اور غیر مسلم ممالک میں متعدد اسلامی مالیاتی اداروں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ مغربی ایشیا میں واقع مسلم ممالک کی کئی یونیورسٹیوں نے اسلامی معاشیات کی باقاعدہ تدریس کا اہتمام کیا ہے۔ بعض برطانوی اور امریکی یونیورسٹیوں نے بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری کی خاطر لکھے جانے والے مقالات کے لئے اسلامی معاشیات سے متعلق موضوعات قبول کیے ہیں اور مکمل ہو جانے پر ان مقالات پر ڈگریاں عطا کی ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اسلامی معاشیات پر اعلیٰ درجہ کی تحقیقات کرنے کی غرض سے قومی اور بین الاقوامی تحقیقاتی اداروں کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔

اس ساری سرگرمی اور ہماہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشیات میں لوگوں کی دلچسپی اور تجسس میں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اسلام، اس کے طرز زندگی اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں، لیکن معاشیات سے علمی دلچسپی رکھتے ہیں، اس قسم کے سوالات اٹھانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ کیا اسلام واقعی ایک متبادل سماجی و معاشی نظام پیش کرتا ہے جو سرمایہ داری اور سوشلزم سے مختلف ہے؟ کیا یہ موجودہ صنعتی تہذیب کی پیچیدگیوں سے کماحقہٗ

عہدہ برآ ہوسکتا ہے؟ کیا یہ ان سنگین مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے، جن کے سامنے ہم عصر سماجی فلسفے اپنے آپ کو مجبورِ محض پاتے ہیں؟ کیا اسلامی معاشیات جیسے کسی علم کا واقعی وجود ہے، یا ہوسکتا ہے، یا اس کی ضرورت ہے؟ وغیرہ۔

اس مقالہ کا مقصد اردوداں طبقہ کے سامنے اسلامی معاشیات اور اس کے موضوعات کا ایک تعارف پیش کرنا ہے کیونکہ اسلامی معاشیات پر جو تحقیقی اور فنی کام ہوا ہے وہ بیشتر انگریزی، عربی اور کسی حد تک ترکی زبانوں میں ہے جن تک اردوداں طبقہ کی رسائی محدود ہے۔

اسلامی معاشیات کا ظہور

نہ صرف اسلامی معاشیات بلکہ علم معاشیات کو بھی نسبتاً ایک جدید علم تصور کیا جاتا ہے۔ اگر ''ایڈم اسمتھ'' کی کتاب ''دولتِ اقوام کے اسباب وعلل کی جستجو'' (An Enquiry into Nature and Causes of Wealth of Nations) کی اشاعت کو نقطۂ آغاز مان لیا جائے (جیسا کہ تاریخ معاشیات کی بیشتر درسی کتابوں میں کیا جاتا ہے) تو معاشیات کی تاریخ دو، سوا دوسو سال سے کچھ ہی زیادہ بنتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ریاضیات، طب، طبیعات، کیمیا، فلکیات، فلسفہ اور تاریخ جیسے علوم کی تاریخ کئی ہزار سال پر محیط ہے۔ اس لئے معاشیات کو ان علوم کی بہ نسبت ایک جدید علم قرار دیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں معاشیات کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک اینگلوسیکسن علم ہے، کیونکہ معاشیات کے بیشتر اصول وقوانین اینگلوسیکسن اقوام کے افراد کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ بہ حیثیت علم، معاشیات کی تدوین جس زمانہ میں ہوئی وہ اینگلوسیکسن تہذیب کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر معاشیات کے علمی کارناموں میں ان کا حصہ دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں قدرے زیادہ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری عالمی تہذیبوں اور دوسرے زمانوں میں معاشی مسائل کے بارے میں سرے سے کوئی غور وفکر ہی نہیں کیا گیا اور ان کا دامن ان کارناموں سے خالی ہے۔ دراصل معاشی افکار کی تاریخ اس طرح

مرتب کی جاتی رہی ہے کہ اس کو خالص اینگلوسیکسن اقوام کا کارنامہ قرار دیا جاسکے۔ اس کلیہ سے اگر کوئی استثناء ہے تو وہ ابن خلدون (732-808ھ مطابق 1332-1404ء) ہے جن کے خیالات کو معاشی افکار کی تاریخ میں جگہ دی گئی ہے۔ مشہور جرمن ماہر معاشیات جوزف شوم پیٹر (Joseph Schumpeter) نے اپنی کتاب ''معاشی تجزیہ کی تاریخ'' (History of Economic Analysis) میں ابن خلدون کے کارناموں کا خصوصی تذکرہ کیا ہے، اس ایک استثناء کے ساتھ غالباً یہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ عام طور پر معاشی مؤرخین اور ماہرین معاشیات نے معاشی فکر کی اسلامی روایت اور معاشیات کے ضمن میں مسلم مفکرین کے علمی کارناموں کو نظر انداز کیا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ طرز عمل ارادی ہے یا غیر ارادی، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ (150ھ مطابق 1738ء) امام مالکؒ (479ھ مطابق 768ء) امام ابویوسفؒ (182ھ مطابق 801ء) شیبانیؒ (181ھ مطابق 804ء) ابوعبیدؒ (224ھ مطابق 838ء) ماوردیؒ (450ھ مطابق 1085ء) ابن حزمؒ (456ھ مطابق 1064ء) غزالیؒ (505ھ مطابق 1110ء) اور ابن تیمیہؒ (728ھ مطابق 1328ء) کے معاشی افکار کا سنجیدگی سے گہرا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اگر ان کے اور دوسرے مسلم مفکرین کے معاشی افکار کا تفصیلی اور عمیق مطالعہ کیا جائے اور مروجہ معاشی تصورات کے ارتقاء سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو نہ صرف یہ ہوگا کہ ان مفکرین کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ معاشی تصورات کے ارتقاء کی تاریخ میں بھی قابل لحاظ زمانی اضافہ کی امید کی جاسکتی ہے۔

عام طور پر معاشیات کی تاریخ جس طرح بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ معاشی تفکیر کا آغاز ارسطو (384-322 قبل مسیح) سے ہوا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں کلامی مکتب فکر (Scholastic School) کے علماء نے ارسطو کی فکر کو آگے بڑھایا، پھر چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں تجارت پسند (Mercantalist) اور سولہویں و سترہویں صدی عیسوی میں زراعت پسند (Pysiocrats) مفکرین نمودار ہوئے، اس پورے عہد میں معاشی تفکیر کی

صورت حال یہ رہی کہ اہم معاشی مسائل کے بارے میں جہاں تہاں اظہار خیال کیا گیا اور سماجی فلسفہ کے ضمن میں بعض معاشی تصورات کا استعمال کیا گیا۔ جس کتاب میں علم معاشیات کو منضبط اور مربوط شکل میں پیش کیا گیا وہ آدم اسمتھ کی ''دولت اقوام'' (Wealth of Nations) تھی جو 1776ء میں شائع ہوئی۔ ارسطو سے لے کر کلامی اسکول کے علماء کے ظہور کے درمیان ایک بڑا زمانی فاصلہ ہے جس میں کسی طرح کی علمی تحریک نظر نہیں آتی۔ مغربی مؤرخین نے یہ کہہ کر اس زمانی خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ ایک تاریک عہد تھا جس میں یوروپ جہالت اور غفلت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، درست! لیکن کیا اس زمانے میں پوری نسل انسانی کا ذہن اتنا بنجر ہو چکا تھا کہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی معاشی موضوعات جیسے پیداوار، تقسیم، تبادلہ، بازار، قیمت اور زر کے بارے میں کوئی سوچ بچار نہیں کیا گیا؟ غالب گمان یہی ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہونا چاہیے، فکر انسانی میں تو ایک تسلسل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جب دنیا کا کوئی حصہ تاریک عہد (Dark Ages) میں داخل ہو جاتا ہے تو دانشوری کے مراکز دوسرے حصوں میں منتقل ہو جاتے ہیں، اس لئے منطقی بنیاد پر معاشی افکار کی تاریخ میں بھی تسلسل ہونا چاہیے، لیکن جس طرح یہ تاریخ لکھی جاتی رہی ہے اس میں تسلسل کے بجائے ایک بڑا تاریخی خلاء پایا جاتا ہے۔

اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ جب یوروپ ''تاریک عہد'' میں تھا اور اس کی ذہنی قوتیں سوئی پڑی تھیں اس وقت اسلامی دنیا علمی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اس کی یونیورسٹیاں طلبہ اور اساتذہ سے آباد تھیں۔ اس کے علماء، دانشور، فلاسفہ، مفکرین اور فقہاء مختلف علوم کی آخری سرحدوں پر علمی تحقیق اور چھان بین میں مصروف تھے، انسانی اعمال کے معاشی پہلو بھی ان کی توجہ و تحقیق سے محروم نہیں رہے اور اس میدان میں بھی انھوں نے دوسرے علوم کی طرح اہم اور وقیع کام سرانجام دیا۔ جس وقت یوروپ میں معاشی فکر انتشار کا شکار تھی اس وقت اسلامی دنیا میں کتاب الخراج اور کتاب الاموال جیسی کتابیں لکھی جارہی تھیں۔

مسلم علماء اور مفکرین نے اپنے عہد کے اہم معاشی مسائل پر اسلامی اقدار اور شریعت

کے فراہم کردہ بنیادی ڈھانچہ کی روشنی میں غور وخوض کیا۔اس وقت اسلامی ممالک کی معاشی تنظیم بھی اسلامی اقدار سے ہم آہنگ تھی۔اس لئے اسلامی مفکرین کے افکار وتصورات معیشت کی عملی کارکردگی میں ممد ومعاون تھے۔بدقسمتی سے دو ایسے واقعات نے اس عمل میں رخنہ اندازی کی جن کا تعلق خارجی دنیا سے تھا اور جن کے باعث علمی ارتقاء کا یہ تسلسل نہ صرف یہ کہ برقرار نہ رہ سکا بلکہ زوال پذیر ہوگیا۔ان میں سے پہلا واقعہ تو سقوط بغداد (1258) تھا جس نے علمی ترقیوں کی راہ مسدود کردی۔تخلیقی فکر اور اجتہاد وتحقیق سے ہٹ کر توجہ صرف علمائے سلف کی تحریروں کی شرح وتعبیر تک محدود ہوکر رہ گئی۔اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا اور تقلید کی راہ کھل گئی۔''پابستگیِ رسم ورہِ عام'' علمی فکر کا معراج قرار پائی۔طرزِ فکر کے مروّجہ سانچوں کے خلاف ہٹ کر کوئی بات کہنا ''طعنِ عام'' کا سبب بننے لگا۔یہ صورت حال کئی سو برس تک قائم رہی بلکہ اس رویّہ کے باقیات اب تک مختلف مسلم ممالک اور معاشروں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔دوسرا سانحہ جس کے مضمرات پہلے واقعہ سے کم ضرر رساں اور دور رس نہ تھے، اٹھارہویں صدی میں وقوع پذیر ہوا، جب بہت سے مسلم ممالک نو آبادیاتی تسلط کا شکار ہوگئے۔سقوط بغداد نے صرف مسلم اقتدار پر ضرب لگائی تھی۔ مغربی ممالک کے نو آبادیاتی تسلط نے نہ صرف یہ کہ سیاسی اقتدار کو نشانہ بنایا بلکہ اسلامی اقدار اور اداروں کو بھی تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا اور اسلامی معاشروں میں اجنبی اقدار کو رواج دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد زیادہ تر مسلم ممالک نو آبادیاتی تسلط سے آزاد ہوگئے۔لیکن سیاسی آزادی سے قبل ہی بیشتر مسلم ممالک میں اسلامی اقدار کی دریافت نو اور اسلامی تشخص کی بازیافت کا عمل شروع ہوچکا تھا۔مختلف مسلم ممالک میں ایسے مفکر اور علماء پیدا ہوئے جنھوں نے اسلامی نظام کے عناصر اور اس کی برکتوں پر از سر نو زور دیا اور اسلامی تعلیمات کی تعبیر عصری مسائل کے حوالے سے کی۔مفتی محمد عبدہ، رشید رضا، محمد جمال الدین افغانی اور ان کے کچھ بعد علامہ اقبال کی نگارشات میں جملہ تہذیبی امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی تہذیب اور اس کے تشخص کو

ابھارنے کی کوشش کی گئی، پھر زمانہ کے تقاضہ کے مطابق علماء کی توجہ موجودہ عہد کے معاشی مسائل کی جانب گئی اور انھوں نے موجودہ صنعتی نظام کے حوالے سے اسلام کی معاشی تعلیمات اجاگر کیں۔ 1940ء کے لگ بھگ اور اس کے بعد کے برسوں میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، حسن البنا اور سید قطب کے ایسے افکار سامنے آئے جن میں اسلام کے اقتصادی نظام کے نمایاں پہلو اجاگر کیے گئے تھے۔ 1946ء میں ایک مسلم ماہر معاشیات ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی کتاب ''اسلام اور نظریہ سود'' (Islam and Theory of Interest) منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں پہلی بار ایک جدید تعلیم یافتہ ماہر معاشیات نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ معاشی نظریات کی قدر و قیمت کا تعین اسلامی اقدار کے تناظر میں کیا جائے۔ 1967ء میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی کتاب ''غیر سودی بینک کاری'' شائع ہوئی جس میں غالباً پہلی بار تجارتی بینک کاری کو غیر سودی بنیادوں پر قائم کرنے کا تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا، اس وقت سے آج تک ان مسلم ماہرین معاشیات کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو چکا ہے، جو معاشی عمل اور معاشیات کا مطالعہ اسلامی تناظر میں کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی معاشیات کے موضوع پر انگریزی اور عربی میں قابل لحاظ علمی سرمایہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اسلامی معاشیات کے نام پر اس وقت جو لٹریچر موجود ہے اس کا انداز مناظرانہ نہیں ہے بلکہ اس کا طریق کار تجزیاتی ہے، کیونکہ اس میں معاشی تجزیہ (Economic Analysis) کے متداول اور معروف فنی طریقہ کار سے کام لیا جاتا ہے۔ اسلامی معاشیات کے اس روز افزوں لٹریچر کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ اسلامی اقدار پر مشتمل اقتصادی نظام کیوں کر قائم کیا جا سکتا ہے اور قائم ہونے کے بعد یہ نظام کس طرح کام کرے گا؟

تاریخی اعتبار سے اسلامی اقتصادی نظام کی جانب توجہ غیر سودی نظام بینک کاری کے توسط سے مبذول ہوئی۔ موجودہ زمانے کی معیشت میں بینک کاری کی اہمیت اور معاشی زندگی کی

ترقی میں اس کے کردار سے خاص وعام سبھی کسی نہ کسی طور پر واقف ہیں۔ یہ حقیقت بھی عام طور پر معروف ہے کہ جدید بینک کاری نظام سود کی بنیاد پر قائم ہے جبکہ اسلام سود یا ربا کو حرام قرار دیتا ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی نظام کے تحت جدید بینک کاری کا نظام کس طرح عمل پذیر ہوگا؟

اس سوال کا جواب دینے کی کوششوں کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ اسلامی بینک کاری کا نظریہ وجود میں آیا بلکہ اس سے متعلق دوسرے اہم مسائل کی جانب بھی توجہ مبذول ہوئی، مثلاً تخلیق قرض (Credit Creation)، مرکزی بینک کاری، مالی پالیسی کے اغراض ومقاصد وغیرہ، پھر مسلم ماہرین کو جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ مالی پالیسی (Monetary Policy) کسی خلا میں قائم نہیں ہوتی، اس کا تعلق مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy)، ملک کی عام معاشی پالیسی، معیشت میں حکومت کے کردار اور معاشی نظام کے اغراض ومقاصد سے بھی ہے، چنانچہ اسلامی معاشیاتی نقطۂ نظر سے ان تمام موضوعات پر خاصا تحقیقی کام ہو چکا ہے، اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ اس معتد بہ علمی ذخیرے کے نمایاں نقوش سے اردوداں طبقے کو روشناس کرایا جائے۔

اسلامی معاشیات کی ماہیت

اسلامی نقطۂ نظر سے جدید معاشیات کی سب سے بڑی خامی اس کی غیر اخلاقی (ameral) ماہیت ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں بھی اقتصادیات اور اخلاقیات کا جنم ساتھ ساتھ ہوا اور ان کو ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ چونکہ معاشیات انسانی اور سماجی رشتوں سے بحث کرتی ہے اس لئے یہ سماجی اقدار اور اخلاقیات سے بالاتر نہیں ہوسکتی، جدید معاشیات ایک سماجی علم ہونے کے باوجود تیقن کے اس درجہ پر پہنچنے کا دعویٰ کرتی ہے جو قدرتی علوم کو حاصل ہے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قدرتی علوم بالخصوص جدید طبیعات، کامل تیقن کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اپنے نتائج کی ظنی حیثیت اور قیاسی نوعیت کو علی الاعلان بیان کرتے ہیں)۔ اس درجہ تیقن پر پہنچنے کے لئے جدید معاشیات اپنی مثبت ماہیت اور اقدار سے بے گانگی پر زور دیتی ہے۔ اس

کے برعکس اسلامی معاشیات بعض اہم مگر فراموش شدہ تصورات، جیسے صحیح اور غلط، مناسب اور نامناسب، جائز اور ناجائز وغیرہ کو تجزیہ میں شامل کرنا چاہتی ہے، جدید معاشیات کا محور کارکردگی (Efficiency) کا حصول ہے۔ اسلامی معاشیات میں کارکردگی کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشی انصاف پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ جدید معاشیات میں تجزیہ کی بنیاد فرد اور انفرادی مفاد ہے، وہ اس مفروضہ کو مسلم مان کر چلتی ہے کہ انفرادی مفاد معاشی اعمال کا واحد طاقتور محرک ہے۔ اسلامی معاشیات کے ماہرین اس پر اصرار کرتے ہیں کہ فرد کے ساتھ جماعت اور انفرادی مفاد کے ساتھ ساتھ اجتماعی مفاد کا خیال رکھنا بھی فرد کی اخلاقی (اور مذہبی) ذمہ داری ہے۔ مزید یہ کہ بعض غیر معاشی جذبات جیسے ہمدردی، حب الوطنی اور خوفِ خدا وغیرہ بھی معاشی افعال کے محرک ہو سکتے ہیں۔ اسلامی معاشیات اس بات کی منکر نہیں ہے کہ انفرادی مفاد کا جذبہ بہت سے معاشی افعال کا ایک بڑا اور حتمی محرک ہے، لیکن وہ انفرادی مفاد کو اس قدر بے قید اور آزاد نہیں چھوڑنا چاہتی کہ دوسرے افراد کے مفادات معرضِ خطر میں پڑ جائیں۔ اس لئے سماجی فلاح کا تقاضہ ہے کہ انفرادی مفاد اور انفرادی محرکات اجتماعی مصالح، ذمہ داری اور اخلاقیات کے تابع فرمان رہیں۔ معاشی عقلیت اور انفرادی مفاد کسی اخلاقی اور قانونی دائرہ میں رہ کر ہی بہتر طور پر کام کر سکتے ہیں۔ اسلامی معاشیات کے سلسلہ میں یہ اخلاقی اور قانونی دائرہ شریعت کا عطا کردہ ہے۔

معاشیاتی تجزیہ میں سماجی اور اخلاقی اقدار اسی دائرہ کے ذریعہ داخل ہوتی ہیں۔ نظریاتی معاشیات کی سطح پر، یہ اقدار چار طریقوں سے تجزیہ پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ مفروضات کے اختیار کے ذریعہ، معاشی قضایا کے اختیار کے ذریعہ، ان قضایا کی تفتیش کے لئے جو ذرائع استعمال کئے جائیں ان کے ذریعہ اور تجزیہ کے طریق کار کے ذریعہ، اس طرح اقدار سے فرار کا کوئی امکان نہیں۔ مغرب میں مثبت معاشیات کی اقدار سے بے گانگی کے جو دعوے کیے جاتے

ہیں ان کی کوئی ٹھوس علمی بنیاد نہیں ہے۔ مثبت معاشیات میں بھی اقدار ان ہی چار طریقوں سے داخل ہوتی ہیں۔ چونکہ مغربی معاشیات کا ارتقاء مغربی تہذیب کے تناظر میں ہوا ہے اس لئے اس میں پائی جانے والی اقدار مغربی تہذیب سے مستعار لی گئی ہیں، لیکن مثبت معاشیات اپنے معیاری (Normative) پس منظر کو اجاگر کرنے کے بجائے معروضیت کے بلند بانگ دعوے کرتی ہے۔

دوسری طرف اسلامی معاشیات علی الاعلان یہ تسلیم کرتی ہے کہ اس کی اقدار کا منبع اسلامی مصادر ہیں اور وہ اس کے طریق کار کا جزء لاینفک ہیں۔ اسلامی معاشیات میں مفروضات اور سماجی اقدار اسلامی مصادر سے، اور مثبت بیانات جدید معاشیات اور اسلامی مصادر دونوں سے لئے جاتے ہیں، اس طرح اقدار، مثبت بیانات اور سماجی رشتوں کو معروف طریق ہائے تجزیہ سے ایک منضبط و مربوط شکل دی جاتی ہے۔

ایک منضبط علم کی حیثیت سے اسلامی معاشیات کی زمانی عمر کم سہی اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسلامی معاشیات ابھی اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہی ہے، لیکن اس کے مندرجات اور اس کے فلسفیانہ پس منظر کے بارے میں بھی یہی بات نہیں کہی جاسکتی۔ اس کے پس منظر میں اسلامی فکر کی ایک صحت مند اور طاقتور روایت ہے۔ ماضی میں اسلامی مفکرین، فقہاء اور صوفیا نے بھی قیمتوں کے نظام، زر، تجارت، تبادلہ، بازار، تجارتی چکر، عوامی مالیات، حکومت کے حقوق وفرائض اور مالیاتی پالیسی جیسے موضوعات پر غور وفکر کیا ہے۔ اسلامی فکر کی یہ وراثت اسلامی معاشیات کا سرمایہ ہے، لیکن اس ورثہ کو از سر نو دریافت کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ عصر حاضر کی ضروریات کی روشنی میں ان کی افادیت کا فیصلہ کیا جاسکے اور اگر مناسب ہو تو اس روایت کو آگے بڑھانے کے لئے اقدامات کیے جائیں۔

اسلامی معاشیات اور فقہ اسلامی

ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اسلامی معاشیات کی جڑیں اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاقیات میں پیوست ہیں، اس لئے فطری ہے کہ اس کا اسلامی علوم سے بھی گہرا رشتہ رہا ہو۔ اسلامی علوم کو عام طور پر چار مختلف علوم میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) علوم القرآن (۲) علوم الحدیث (۳) اصول فقہ (۴) فقہ۔ ضروری ہے کہ اس مرحلہ پر شریعت اور فقہ کے درمیان امتیاز کو واضح کر دیا جائے، شریعت کا مفہوم ان تمام خدائی احکامات سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کی جانب وحی کے ذریعہ نازل فرمائے۔ اس طرح قرآن پاک اور سنت رسول اللہ ﷺ شریعت کا جزو ہیں۔ یعنی قرآنی احکامات اور سنت رسول ﷺ کو تشریعی درجہ حاصل ہے۔ شریعت مستقل، نا قابل تنسیخ و تردید اور زمان و مکان سے ماورا ہے، اس کی ماہیت غیر تاریخی ہے۔ فقہ، الٰہی احکامات کے انسانی فہم و ادراک کا نام ہے، اس لئے اس میں زمان و مکان کے ساتھ تبدیلی کے امکانات پوشیدہ ہیں، فقہ کی نوعیت بنیادی طور پر انسانی ہے، الوہی نہیں، گو کہ اس کے احکامات کا استنباط شریعت سے ہی کیا جاتا ہے۔ اس لئے فقہ کی ماہیت تاریخی ہے، یہ زمان و مکان کی پابندیوں کے تابع ہے۔ قرآن اور سنت سے احکامات کا استنباط چند اصولوں کے مطابق کیا جاتا ہے، ان اصولوں کا مطالعہ اصول فقہ میں کیا جاتا ہے۔

اسلامی فقہ کے چار بنیادی مصادر ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس یا اجتہاد، اسلامی علوم کے وہ ماہرین جو احکام اعلیٰ کی تشریح کرتے ہوئے اجتہاد کر سکتے ہیں مجتہد کہلاتے ہیں، لیکن ہر کوئی نہ مجتہد ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی توقع کی جاتی ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ماہرین معاشیات اور سماجی علوم کے دوسرے ماہرین، جو اہم ہم عصر مسائل کے اسلامی حل دریافت کرنا چاہتے ہوں اور اپنے اپنے علوم کا مطالعہ اسلامی تناظر میں کرنا چاہتے ہوں، اسلامی فقہ کا ضروری علم حاصل کریں۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ فقہ اسلامی میں اختصاص حاصل

کریں یا فقیہ بن جائیں اور ہر کس وناکس اجتہادی رائے دینے لگ جائے۔ فی الحقیقت سماجی علومِ کے اسلامی تناظر میں تحقیقی کام کرنے کے لئے فقہ کا صرف اتنا علم ضروری ہے کہ سماجی علوم کے ماہرین فقہی اور غیر فقہی آراء اور بیانات کی اسلامی نوعیت کا صحیح صحیح تعین کر سکیں۔

اسلامی فقہ کو دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ فقہ عبادات اور فقہ معاملات، اول الذکر کا تعلق خالق اور مخلوق کے مابین تعلقات سے ہے جبکہ موخر الذکر کا محور انسانوں کے باہمی تعلقات ہیں، گو کہ تمام مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ فقہ عبادات کا کچھ علم حاصل کریں (مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے مسائل، تاکہ وہ ان عبادات کو صحیح طور پر انجام دے سکیں)، ماہرین معاشیات اور سماجی علوم کے دوسرے ماہرین کے لئے فقہ معاملات خاص اہمیت کا حامل ہے۔

اسلامی معاشی نظام

اسلامی معاشیات دراصل اسلامی معاشی نظام کے مطالعہ کا نام ہے، بالکل اسی طرح جیسے سرمایہ دارانہ معاشیات سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی معاشیات، اشتراکی نظام کا مطالعہ ہے، اس لئے اسلامی معاشیات کی ماہیت کی وضاحت کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہم اسلامی معاشی نظام کی ماہیت کو واضح کر دیں اور مختلف پہلوؤں سے اس کی کارکردگی کا مطالعہ کریں۔

معاشی نظام سے ہماری مراد ان تمام اداروں، اور ان اداروں کے پس پشت کارفرما اصولوں سے ہے جو کوئی معاشرہ اپنے معاشی مقاصد کو حل کرنے کے لئے قائم کرتا ہے، کسی بھی معاشی نظام کے اجزائے ترکیبی میں ان عناصر کا ہونا ضروری ہے: (۱) معاشی نظام کے مقاصد کا تعین (۲) ان مقاصد کو حاصل کرنے کے ذرائع کا تعین (۳) ان اداروں کا قیام جن کے ذریعہ معاشی نظام اپنی کارکردگی انجام دے۔ اسلام کے معاشی نظام کا مطالعہ بھی انھیں اجزائے ترکیبی کے حوالہ سے کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک معاشی اداروں کا سوال ہے، کسی بھی معیشت میں معاشی وسائل کی ملکیت کے سوال کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً سرمایہ دارانہ معیشت کی ممتاز خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں افراد کو نجی ملکیت کا حق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشی نظام میں ملکیت کے حق کے ساتھ ساتھ وسائل کے مالکوں پر کچھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی عائد کی جاتی ہیں۔

اسلامی معاشی نظام میں جائداد کی ملکیت کے تین بڑے اور معروف طریقے ہیں: نجی ملکیت، عوامی ملکیت اور رضا کارانہ اجتماعی ملکیت (اوقاف)۔ نجی ملکیت کے سلسلہ میں فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اسلام نہ صرف نجی ملکیت کا حق دیتا ہے، اسے تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کا احترام بھی کرتا ہے، لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کے برعکس اسلامی نظام میں جائداد کی نجی ملکیت کا حق ایک مطلق حق نہیں ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے نجی جائداد، افراد کے پاس اللہ کی ایک امانت ہے، کیونکہ آخری تجزیہ کے طور پر وہی ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو اس نے پیدا کی ہیں، پس افراد کا فرض ہے کہ وہ اس امانت کا استعمال اس طور پر کریں جو معاشرے میں شر کے بجائے خیر کا باعث ہو، سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح اسلامی معاشی نظام میں افراد کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی جائداد کا کوئی غلط استعمال کرسکیں یا اسے برباد کرسکیں۔ فی الحقیقت اسلام جائداد اور دیگر معاشی وسائل کے بہترین استعمال کی نہ صرف تعلیم دیتا ہے بلکہ ضروری احکام کے ذریعہ اسے ناگزیر بھی بنادیتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص اپنی جائداد کا صحیح انتظام نہیں کرتا (یعنی فقہی اصطلاح میں سفیہ ہے) تو ریاست کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اس کی جائداد کے مناسب انتظام وانصرام کے لئے کسی متولی کا تقرر کرے، اسی طرح اہل ثروت کو اپنی دولت کے زیاں، اس کے ناجائز استعمال، اور اس کو تباہ و برباد کرنے کا حق نہیں ہے، اسلام اہل ثروت پر بعض اخلاقی پابندیاں عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے وسائل کا صحیح استعمال کریں، کیونکہ روز آخرت اہل ثروت کو اس بات کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی دولت کا استعمال کس طرح کیا۔

اسلامی معاشی نظام میں عوامی ملکیت جائز ہے، لیکن نجی ملکیت کی طرح عوامی ملکیت کا تصور بھی مطلق نہیں ہے۔ اگر انفرادی ملکیت کے حقوق محدود ہیں تو ریاستی ملکیت کے حقوق بھی محدود ہونے چاہئیں۔ اگر افراد خدا کے سامنے جواب دہ ہیں تو اسی طرح ریاست اور اس کے چلانے والے بھی عوام اور خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ معیشت میں ریاست کی دخل اندازی کا فیصلہ اور معیار مصلحت عامہ کے مطابق ہوگا، جس کا تصور امام غزالیؒ اور شاطبیؒ نے پیش کیا ہے۔

اسلامی معاشی نظام کا ایک مخصوص اور ممتاز ادارہ وقف کا نظام ہے جو رضا کارانہ اجتماعی ملکیت کی ایک شکل ہے۔ اس ادارہ کے ذریعہ اہل ثروت مسلمان اپنی دولت اور جائداد یا اس کا کوئی حصہ عام معاشرتی فلاح و بہبود یا کسی ایسے مقصد کے لئے جو اپنے آپ میں اخلاقی یا مذہبی نقطۂ نظر سے قابل قدر ہو، محفوظ کر سکتے ہیں۔ نظام اوقاف کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ یہ حکومت کی دخل اندازی کے بغیر رضا کارانہ اجتماعی اقدام کے ذریعہ فلاحی سرگرمیوں کے منظّم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ماضی میں ایک ادارہ کے طور پر اوقاف نے اسلامی ممالک میں فلاح و بہبود خاص کر تعلیم، طبی سہولتوں اور سماجی تحفظ کے میدانوں میں ایک نہایت مفید کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادارہ موجودہ اسلامی معاشروں کی تعمیر نو اور ترقی میں بھی ممدو معاون ہونے کے بے پناہ امکانات رکھتا ہے۔

نظام ملکیت کے علاوہ معاشی نظام کا مطالعہ کرنے کے لئے معیشت کے مقصد، منہاج محرکات، فیصلہ سازی کے نظام اور حکومت کے کردار کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے۔ جزئی سطح پر صرف، پیداوار، تبادلہ اور تقسیم کے مختلف پہلوؤں کے تجزیہ کی بنیاد پر بھی مختلف معاشی نظاموں کے درمیان تمیز کی جا سکتی ہے۔ اسلامی معاشی نظام میں محرک کا تعین صرف دنیوی بنیادوں پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ نجات اخروی کا احساس بھی معاشی افعال کا محرک ہو سکتا ہے۔ عوامی اہمیت کے مسئلوں پر فیصلہ شوریٰ کے ذریعہ ہونا چاہئے۔ دوسرے تمام معاشی فیصلے اصولی طور پر بازار میں کیے جا سکتے ہیں جب کہ حکومت ان فیصلوں میں توازن لانے اور برقرار رکھنے کا کام انجام دے سکتی ہے۔

مسلم ماہرین معاشیات کے درمیان اس پر کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں حکومت کا کردار کیا اور کتنا ہونا چاہیے۔ کچھ ماہرین، معیشت میں حکومت کی بیش از بیش مداخلت چاہتے ہیں، جبکہ دوسرے معیشت میں حکومت کے فعال کردار کے مخالف ہیں اور اس کا کردار محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں مواقف کی حمایت میں تاریخی اور فقہی دلائل دیے جاسکتے ہیں، تاہم اسلام کی اصل راہ توازن اور اعتدال کی راہ ہے۔ اس لئے شاید بیشتر لوگ اس بات سے اتفاق کرلیں گے کہ اسلامی معیشت میں حکومت کا کردار نہ تو خالص سرمایہ دارانہ نظام کی طرح بہت محدود ہے اور نہ اشتراکی نظام کی طرح کلّیت پسند۔ اس کے برعکس حکومت اسلامی نظام میں، نگہبانی اور رہنمائی دونوں فرائض انجام دے گی۔ اسلامی معیشت میں اگر نجی اور عوامی مصالح کے درمیان ٹکراؤ کی کوئی صورت پیدا ہوئی، تو حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان مصالح کے درمیان توازن لانے کی غرض سے معیشت میں مداخلت کرے۔ بصورت دیگر حکومت کی عام نگہبانی اور رہنمائی میں نجی معیشت اپنے فیصلوں کے لئے آزاد ہوگی۔

اسلامی معاشیات کے ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دولت وثروت کی تقسیم میں عدل وانصاف کو غایت درجہ اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں بعض مسلم ماہرین معاشیات کا خیال یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی، عدل اور احسان کے اسلامی اصولوں سے رہنمائی حاصل کرے گی۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ معاشرہ میں ہر فرد کو سماجی ومعاشی انصاف حاصل ہو، اسلامی ریاست اپنی حدود میں رہنے والوں کی بنیادی ضروریات کی تسکین کے لئے مناسب اور ضروری اقدام کرے گی۔ اس مقصد کے حصول کے ساتھ ساتھ معیشت دوسرے شرعی مقاصد کے حصول کے لئے بھی کوشاں ہوگی، مثلاً آمدنی اور دولت کی نابرابری میں تخفیف، افراد کے نفس باطنی اور اموالِ ظاہرہ کا تزکیہ اور عوام میں جذبۂ خیر سگالی کا فروغ۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لئے اسلامی معیشت کئی ذرائع استعمال کرسکتی ہے، فطری طور پر ان ذرائع میں

زکوٰۃ کے نفاذ اور محاصل زکوٰۃ کی تقسیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ان مقاصد کے حصول میں زکوٰۃ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی معیشت میں تقسیم دولت پر اثر انداز ہونے والے دوسرے ادارے اور ذرائع کم اہمیت کے حامل ہیں یا سرے سے مفقود ہیں۔ فی الواقع یہ نقطۂ نظر حقیقت سے بعید ہے، کیونکہ اسلامی معاشرہ میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی ایسے کئی ادارے ہیں، مثلاً ربا کی حرمت، مشارکت اور مضاربت کا فروغ، نفع میں شرکت کی عام ترغیب، اجارہ داری کی ممانعت، وراثت کے قوانین، فطری ذرائع پیداوار میں عوام کے مساوی حقوق وغیرہ بعض ایسے ادارے ہیں جو معاشرے میں آمدنی اور دولت کی نابرابری کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں تاکہ "لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْأَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ" (اور یہ دولت تم میں سے اہل ثروت کے درمیان ہی چکر نہ کاٹتی رہے) کا قرآنی مقصد حاصل ہو سکے۔

جزئی معاشیات

اسلامی معاشیات کے تشکیلی عناصر میں سے جزئی معاشیات (Micro Economics) غالباً سب سے کم ترقی یافتہ ہے، تاہم اسلامی معاشیات کے کئی ماہرین نے اسلامی تصورات اور اسلامی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظری معاشیات (Economic Theory) کی تشکیل نو کی قابلِ قدر کوششیں کی ہیں۔ اس ضمن میں ان علماء کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ انھوں نے معاشیات کے متداول اصول تحلیل وتجزیہ کا استعمال کرتے ہوئے انسانی برتاؤ اور معاشی رویہ کا مطالعہ ایسی حالت میں کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی اقدار اسلامی مصادر سے مستعار لی گئی ہوں۔

تاہم اس بات کو واضح کردینا چاہیے کہ اس طریق استدلال کا استعمال کرتے ہوئے جن نتائج کا استنباط کیا جائے، ضروری نہیں وہ مسائل کے ایسے اسلامی حل ہوں کہ ان کے سوا دوسرا حل ممکن نہ ہو، فی الحقیقت یہ نتائج ان تمام اعتراضات کی حد میں آسکتے ہیں جو نظریاتی طریق

استنباط پر عام طور پر عائد کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اس طرح کے نتائج مفروضات کی تبدیلی کے تئیں کافی حساس ہوتے ہیں، اگر مفروضات میں ذرا بھی تبدیلی کردی جائے تو ضروری نہیں کہ منطقی طور پر دوبارہ انھیں نتائج کا استنباط کیا جاسکے جو پہلے اخذ کیے گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ جن ماہرین معاشیات نے نظریاتی سطح پر اس طرح کی کوششیں کی ہیں ضروری نہیں کہ ان سب کو شریعت کا کماحقہ، علم ہو۔ اس لئے اس امر کا بھی کافی احتمال ہے کہ ان کی تعبیریں ہر حلقہ فکر کے لئے یکساں طور پر قابل قبول نہ ہوں۔

تاہم ان دشواریوں کے باوجود اسلامی تناظر میں جزئی معاشیات کی نشوونما، اسلامی ماہرین معاشیات کے لئے اور مستقبل میں اسلامی معاشیات کے ارتقاء اور فروغ کے لئے غالباً سب سے بڑا چیلنج ہے، کیونکہ بالآخر یہ جزئی معاشیات ہی ہے جو نہ صرف کلی معاشیات بلکہ معاشی پالیسیوں کے لئے بھی نظریاتی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ اس چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے بعض ماہرین معاشیات نے کچھ قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ ان میں سے چند کا اجمالی تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

جزئی معاشیات کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کوئی فرد (یا معاشیات کی اصطلاح میں صارف) کسی چیز کی طلب کیوں کرتا ہے؟ معاشیات میں اس سوال کا روایتی جواب یہ ہے کہ صارف ان اشیاء کی طلب کرتا ہے جن میں اسے افادیت محسوس ہوتی ہے اور جو اس کی کسی ضرورت (Wants) کی تسکین کرتی ہیں۔ بعض اسلامی ماہرین معاشیات کی تجویز یہ ہے کہ اسلامی معاشیات میں نظریۂ صرف (Theory of Consumer behavior) کی بنیاد ضرورت کے بجائے حاجت (Need) پر ہونی چاہیے۔ اس طرح افادیت کے نظریہ (Utility Theory) کو مصلحت سے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مصلحت سے مراد کسی چیز یا خدمت کی وہ خاصیت ہے جس کے ذریعہ انسانی زندگی کے کسی مقصد یا بنیادی عنصر کو فروغ ملتا ہو۔ حیات، مال، ایمان، عقل اور نسل کا تحفظ یا فروغ انسانی وجود کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا

جاسکتا ہے کہ اس چیز کے استعمال میں مصلحت ہے یا نہیں۔ افادیت کی طرح مصلحت کا تصور داخلی ہوسکتا ہے، لیکن افادیت کے برعکس اس تصور میں بڑی حد تک معروضیت (Ovjectivity) پائی جاتی ہے۔ تاہم ان تصورات کا استعمال کرتے ہوئے بازار میں اشیاء کی خرید و فروخت اور قیمتوں کے تعین جیسے اعمال کی وضاحت کے لئے ابھی مزید تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

اسلامی معاشیات کے بعض وکلاء نے ذرائع پیداوار اور ان کی قیمتوں کے تعین کی بھی نئی تعبیرات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ روایتی معاشیات میں تین اہم ذرائع پیداوار کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ زمین یا قدرتی ذرائع پیداوار (Land)، سرمایہ (Capital) اور محنت (Labour)، بعض اوقات تنظیم کو ایک چوتھا ذریعۂ پیداوار متصور کیا جاتا ہے۔ ساری پیداوار ان ذرائع کے مالکوں کے درمیان تقسیم ہوجاتی ہے۔ اسے نظریۂ تقسیم کہا جاتا ہے۔ اس طرح کرایہ یا لگان زمین یا قدرتی ذرائع پیداوار کا معاوضہ قرار پائیں گے۔ روایتی معاشیات میں محنت کا معاوضہ اُجرت یا مزدوری اور سرمایہ کا معاوضہ سود ہے، لیکن اسلامی نظام میں سود (ربا) حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے لازم ہوا کہ پیداوار کی تقسیم پر از سر نو نظر ڈالی جائے، اس کے ساتھ ہی ذرائع پیداوار کی نئی تعریف کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ جہاں تک محنت کے لئے اجرت کا سوال ہے اس پر تو کسی قسم کے نزاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بات پر اتفاق رائے کچھ مشکل نہیں کہ محنت کی اجرت اس کی پیدا آوری کے تناسب سے ہونی چاہیے اور اس کا پیداوار میں حق ہے۔ لیکن سود، اجارہ دارانہ منافع اور غیر متناسب لگان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے شدید شبہات موجود ہیں۔ سود کے حرام ہونے کے باعث بعض اسلامی ماہرین معاشیات نے ''سرمایہ'' کی تعریف ایسی شکل میں کرنے کی کوشش کی جس میں ''نقد سرمایہ'' شامل نہ ہو۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اسلام میں سرمایہ کے معاوضہ کی کوئی ممانعت نہیں ہے، بلکہ اس معاوضہ کی ایک خاص شکل کو، جس کا مظہر سود ہے، حرام قرار دیا گیا ہے۔ سود، سرمایہ کے لئے پہلے سے طے شدہ معاوضہ ہے جس کی شرح بھی پیداوار کے نتیجہ (نفع یا نقصان) سے الگ ہوکر مقرر کی جاتی ہے۔

اسلامی معاشیات میں نقد سرمایہ کو پیداوار کے ایک حصہ کا مستحق اسی وقت قرار دیا جاتا ہے جب وہ کاروبار کی خطر انگیزی (Risk) میں شریک ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے نقد سرمایہ کا معاوضہ، سود نہیں بلکہ نفع کا ایک حصہ ہے جو اس خطر انگیزی کے عوض ملتا ہے۔

اسی طرح زمین کے لگان کے متعلق بھی واضح اسلامی اصول موجود ہیں، فقہ کی کتابوں میں عشر اور خراج عائد کرنے کے لئے عشری اور خراجی زمینوں کی تفریق اور ان کے متلقہ خصائص تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

روایتی معاشیات میں پیداوار کا محرک ''منافع'' قرار دیا جاتا ہے۔ گو کہ اسلامی معاشیات میں منافع کا حصول ممنوع نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ تحریک اسلام کے اخلاقی اصولوں کی پابند رہے۔ کچھ ماہرین معاشیات کا یہ خیال ہے کہ اسلامی معیشت میں مختلف قسم کے کاروبار اور صنعتوں کے چلانے کو فرض کفایہ کی حیثیت حاصل ہے۔

کلّی معاشیات

جزئی معاشیات کی نسبت کلّی معاشیات (Aggregate Economics or Macro Economics) نے اسلامی ماہرین معاشیات کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ رہا ہے کہ اسلامی ماہرین معاشیات اس سوال کا جواب دینے کے لئے کوشاں رہے ہیں کہ عصر حاضر میں جب تمام معاصر معاشی نظام اور جدید معیشتیں سودی بنیادوں پر قائم ہیں، اسلامی نظام معیشت اپنے غیر سودی نظام، زکوٰۃ، منافع میں شرکت اور دوسری اسلامی خصوصیات کے ساتھ کس طرح کام کرے گا؟ اس لئے ان کی توجہ اس مسئلہ پر مرکوز ہوئی کہ غیر سودی بینک کاری نظام کس طرح قائم کیا جائے؟ اس کے عملی مسائل کیا ہوں گے اور ایک غیر سودی نظام کا نظریاتی جواز کیا ہے؟ سود کی عدم موجودگی میں زر کے بازار میں توازن کا حصول کس طرح ہوگا؟ کیا سود کی عدم موجودگی بچت اور خواہشِ بچت کے رجحان پر

اثر انداز ہوگی۔ اگر ہاں تو کس طرح؟ معیشت میں وظیفۂ بچت اور وظیفۂ سرمایہ کاری کس طرح سرانجام پائیں گے؟ قومی آمدنی کا تعین کیسے ہوگا اور اس ضمن میں زر پالیسی اور مالی پالیسی کا کردار کیا ہوگا؟

کلّی معاشیات میں نظریۂ اخراجاتِ صرف، وظیفۂ بچت وصرف اور عوامی اخراجات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعہ ہی قومی آمدنی کا تعین ہوتا ہے۔ اخراجاتِ صرف کے سلسلہ میں اسلامی معاشیات کے بعض ماہرین نے رجحانِ صرف (Propensity to Consume) پر زکوٰۃ کے اثرات کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں عام رائے یہی ہے کہ معیشت میں زکوٰۃ کے نفاذ کے اثرات مثبت ہونے کی توقع ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کے ذریعہ دولت کی دوبارہ تقسیم عمل میں آتی ہے اور وہ دولت ان لوگوں کی طرف سے جن کی خواہشِ بچت زیادہ ہے ان لوگوں کی طرف منتقل ہوتی ہے جن کی خواہشِ صرف زیادہ ہے، اس لئے اخراجاتِ صرف میں اضافہ ہوگا، جو آمدنی میں اضافہ کا باعث بھی بنے گا۔

جہاں تک بچت اور سرمایہ کاری کا تعلق ہے، تو ملحوظ رہے کہ جدید معیشت میں بچت کار اور سرمایہ کار ایک ہی لوگ نہیں ہوتے۔ موجودہ زمانہ میں صنعتی پراجیکٹوں کو لاگو کرنا اور چلانا ایک پیچیدہ عمل ہے، جس کو ہر وہ شخص انجام نہیں دے سکتا جس کے پاس تھوڑا بہت سرمایہ ہو، جدید صنعتی زندگی کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بچت کاروں کی ایک بڑی تعداد بہت چھوٹی چھوٹی بچتوں کی مالک ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرمایہ کاری کے لئے بڑی رقوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ بچت کاروں اور سرمایہ کاروں کے گروہوں میں تفریق پیدا ہوگئی ہے، جو لوگ بچت کاری کرتے ہیں وہ خود سرمایہ کاری نہیں کرتے اور جو لوگ سرمایہ کاری کرتے ہیں وہ خود بچت نہیں کرتے۔ اس طرح بچت اور سرمایہ کاری کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مالی ثالثی (Financial Intermediation) کی ضرورت پڑتی ہے۔ روایتی معیشت میں یہ کام سود کے ذریعہ انجام پاتا ہے اور اسلامی معیشت میں یہ وظیفہ منافع میں شرکت کی شرح (Profit

(Sharing Ratio) کے ذریعہ انجام پائے گا، اس سلسلہ میں یہ اندیشہ پایا جاتا ہے کہ ایک غیر سودی نظامِ معیشت، جس میں سود کے بجائے نفع میں شرکت کا نظام رائج ہو، ہوسکتا ہے کہ اتنی بچت کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے، جو سرمایہ کاری کے لئے درکار ہو۔ اس طرح بچت اور سرمایہ کاری میں ہم آہنگی نہ ہوسکے۔

اسلامی ماہرین معاشیات کی بعض تازہ ترین تحقیقات اس کی شاہد ہیں کہ یہ اندیشے بے بنیاد ہیں۔ اسلام میں سرمایہ (بچت) کا معاوضہ ممنوع نہیں ہے بلکہ سود کی شکل میں یہ ممنوع ہے۔ منافع میں شرکت کی شکل میں بچت کا معاوضہ شرعاً بالکل جائز ہے، کیونکہ سود کی طرح نہ تو یہ پہلے سے طے شدہ ہے اور نہ ہی غیر تغیر پذیر۔ اس طرح ماہرین معاشیات اسلامی معیشت کے لئے ایسے وظیفۂ بچت اور وظیفۂ سرمایہ کاری کی تشکیل کرسکتے ہیں کہ بچت کا انحصار تو منافع میں شرکت کی شرح پر ہو اور وظیفۂ سرمایہ کاری اس سے آزاد ہو۔ بعض مسلمات کے تحت یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی مالی نظام میں خطر انگیزی میں اضافہ کے بغیر بچت کے لئے معاوضہ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی مالی نظام میں سودی نظام کے مقابلہ میں استحکام اور نمو کی صلاحیت بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔

بعض ماہرین نے اسلامی معیشت میں آمدنی کے تعین کے لئے مختلف ماڈل بھی تشکیل دیے ہیں، جن میں زکوٰۃ اور منافع کی شرکت کو شامل کیا گیا ہے۔

زر پالیسی اور مالیاتی پالیسی

ربا کی حرمت، زکوٰۃ کے قیام اور منافع میں شرکت کے اصول کے نفاذ کی روشنی میں اسلامی معیشت میں زر پالیسی اور مالیاتی پالیسی کی خاص اہمیت ہے۔ ان موضوعات پر جدید ترین تحقیقات سے یہ نتائج سامنے آئے ہیں کہ روایتی نظام بینکوں میں جمع رقوم کی ظاہری قدر، یا ان جمع کھاتوں پر شرح معاوضہ کی ظاہری قدر (Nominal Value) کی ضمانت نہیں دیتا، جیسا کہ

منافع میں شرکت کے اصول پر قائم اسلامی بینک کاری نظام میں ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلامی بینک کاری نظام میں کھاتہ داروں کو متعین معاوضہ نہ دیے جانے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی بینک کاری کا نظام استحکام کی وہ خاصیت رکھتا ہے، جو روایتی نظام میں موجود نہیں۔ ان نتائج کی روشنی میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک زر پالیسی کے مقاصد اور کارکردگی کا تعلق ہے، اسلامی بینک کاری اور روایتی بینک کاری کے نظام میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس لئے روایتی بینک کاری سے اسلامی بینک کاری نظام کی طرف سبقت کرنے میں کسی مالی بحران کا اندیشہ نہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس میں کسی طرح کے مسائل پیش ہی نہیں آئیں گے۔

اسلامی معاشیات کے موضوع پر ہم عصر لٹریچر کا ایک بڑا حصہ اسلامی بینک کاری، اس کے نفاذ، اثرات، اور دوسرے متعلقات پر مشتمل ہے۔ اسلامی بینک کاری میں بیع کے متعدد طریقوں و معاہدوں کا اطلاق کیا گیا ہے جو کلاسیکی عہد میں رائج تھے۔ لیکن ان معاہدوں کی تفاصیل میں عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق کچھ نہ کچھ کتر بیونت ضرور کی گئی ہے۔ ان معاہدوں میں مضاربت، مشارکت، مرابحہ، اجارہ اور بیع موجل وغیرہ شامل ہیں۔ فی الحقیقت مالی زر میں ان کا استعمال بھی عہد جدید کا اجتہاد ہے، ورنہ اصلاً تو یہ معاہدے اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے وضع کیے گئے تھے۔

عوامی مالیات تو اسلامی معاشیات کا وہ جزو ہے جس کا ارتقاء اسلامی عہد کی ابتداء میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ عصر حاضر میں عوامی مالیات میں مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy) کے مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مالیاتی پالیسی کے مقاصد کی رو سے اسلامی معیشت کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کے لئے بنیادی ضروریات فراہم کرے اور اس مقصد کے لئے وسائل مہیا کرے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ زکوٰۃ کا نظام اسلامی معیشت کی مالیاتی پالیسی میں مرکزی کردار ادا کرے گا۔ اسلامی ممالک میں موجودہ اقتصادی پس ماندگی اور وسیع پیمانہ کی غربت کے پیش نظر زکوٰۃ اور مالیاتی پالیسی کی اہمیت میں دو چند اضافہ ہو جاتا ہے۔

اختتامیہ

مندرجہ بالا صفحات میں اسلامی معاشیات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ چوتھائی صدی میں کی گئی علمی کوششوں کے خدوخال نمایاں ہوجائیں۔ اسلامی معاشیات کو ابھی ترقی کے بہت سے مراحل طے کرنے ہیں۔ اس سلسلہ میں تکنیکی دشواریاں چاہے کتنی بھی ہوں لیکن وہ قابل عبور ہوسکتی ہیں۔اس سلسلہ میں سب سے بڑی دشواری عملی مثالوں کی کمی ہے۔ اب تک جن مسلم ممالک نے اسلامی اقتصادی نظام کی راہ پر بڑھنے کا فیصلہ کیا ہے ان کی تعداد بہت کم ہے۔

معاشیات ایک ایسا علم ہے کہ عملی معاشی زندگی اور نظری معاشیات کی ترقی ساتھ ساتھ ہوئی، جب عملی زندگی میں مسائل پیش آتے ہیں اور ان کے قابل عمل حل دریافت کئے جاتے ہیں تب نظریہ ساز اس کا نظریاتی جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح نئے نظریے وجود میں آتے ہیں۔ نظریہ ہمیشہ اصل زندگی کے حقائق سے پرکھا جاتا ہے۔ معاشیات کی تاریخ نے اسی مرحلہ وار ترقی کو اختیار کیا ہے۔ درحقیقت تمام سماجی علوم، جو مصنوعی تجربہ گاہ سے محروم ہیں، اسی طور پر آگے بڑھتے ہیں، یہاں تک کہ ایک علم کی حیثیت سے فقہ کی ترقی بھی اسی طور پر ہوئی ہے، اس لئے اسلامی معاشیات کی آئندہ ترقی، دوسرے تمام عوامل سے بڑھ کر صرف اس ایک نکتہ پر منحصر ہے کہ اسلامی ممالک کہاں تک اپنی معیشتوں کو اسلامی قالب میں ڈھالتے ہیں اور اسلام کے عالمگیر اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

{}{}{}{}{}

ہندوستان میں اسلامی مالیات

موجودہ مسائل اور امکانات

ہندوستان دنیا میں آبادی کے لحاظ سے چین کے بعد دوسرا بڑا ملک ہے۔اس کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھی قرار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان ایک کثیر المذاہب اور کثیر الثقافت ملک ہے۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد 150 ملین (15 کروڑ) تھی۔ یہاں کی آبادی 82 فیصد ہندوؤں، 12 فیصد مسلمانوں 2.3 فیصد عیسائیوں اور 1.9 فیصد سکھوں پر مشتمل ہے۔ان بڑے مذہبی گروہوں کے علاوہ یہاں جین، بودھ، پارسی وغیرہ دوسرے مذاہب بھی موجود ہیں، لیکن ان کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ شماریاتی نقطۂ نظر سے چنداں اہمیت کی مستحق نہیں۔ ہندوستانی قبائل کی ایک خاصی بڑی تعداد قدیم مذہب کی پیروکار ہے جو آدی واسی (قدیم باشندے) کہلاتے ہیں، لیکن ہندوستانی مردم شماری آدی واسیوں کو ایک مختلف گروہ تسلیم نہیں کرتی، انھیں ہندوؤں میں ہی شامل سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ایک سیکولر آئین نافذ ہے جس کے تحت مختلف گروہوں کو اپنی علاحدہ مذہبی، تہذیبی، لسانی اور نسلی شناخت قائم رکھنے، اور اسے فروغ دینے کا حق بھی حاصل ہے۔

مسلم ممالک کو چھوڑ کر، دنیا کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان میں آباد ہے، گو کہ تازہ ترین سرکاری اعداد وشمار کے مطابق یہ تعداد 15 کروڑ سے کچھ زائد ہے، لیکن غیر سرکاری تخمینوں کے مطابق یہ تعداد 20 کروڑ تک بتائی جاتی ہے۔ تاہم ان غیر سرکاری تخمینوں پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔ مزید برآں، اس معاملہ کے

دونوں فریق صحیح اعداد وشمار کو بگاڑنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا الزام یہ ہے کہ سرکاری اداراے ان کی تعداد کم کر کے بتاتے ہیں تا کہ ان کے جائز حقوق غصب کئے جاسکیں۔ سرکاری اداراے ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان اپنی تعداد میں مبالغہ انگیز اضافہ کا دعویٰ کرتے ہیں، جس کا ان کے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں۔ اب اس قضیہ میں حق خواہ کسی کی طرف ہو، لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اسلامی دنیا سے باہر، ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد قیام پذیر ہے جس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں موجود نہیں۔

اس مقالہ میں ہم اس امر کی تفتیش کرنا چاہتے ہیں کہ ایک اقلیت کی حیثیت سے، جو اتنی بڑی تعداد کی مالک ہے، لیکن جسے کسی حد تک بے حد پیچیدہ تاریخی، سماجی اور سیاسی صورت حال کا سامنا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اسلامی بنک کاری اور مالیات کی معنویت کیا ہے اور وہ اس سے کس حد تک استفادہ کر سکتے ہیں؟ تاہم ضروری ہوگا کہ اس مرکزی نکتہ پر گفتگو سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی سماجی اور معاشی حیثیت کا کچھ اندازہ قائم کر لیا جائے۔

جغرافیائی تقسیم

ہندوستانی مسلمان کسی ایک ہندوستانی ریاست میں مرتکز نہیں ہیں، وہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں آباد ہیں۔ ان کی جغرافیائی تقسیم دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں پھیلے ہوئے ہیں، تاہم ان کی خاصی بڑی تعداد شمالی ہند میں آباد ہے۔ آزاد ہندوستان میں صرف تین ریاستیں ایسی ہیں جن میں ہندوستان میں کل مسلمانوں کی تعداد کا 10 فیصدی سے زائد آباد ہے، اتر پردیش (22%)، مغربی بنگال (14%) اور بہار (12%)۔ اس طرح ان تین ریاستوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی کل تعداد کا 48 فیصد مرتکز ہے، بقیہ 52 فیصد ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں منتشر ہیں [یہ اعداد وشمار 1991 کی مردم شماری پر

مشتمل ہیں، لیکن 2001 کی مردم شماری میں تناسبات میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ بہار کا تناسب 12% سے گھٹ کر 9.9% رہ گیا ہے، کیونکہ بقیہ آبادی جھارکھنڈ کی نوتشکیل شدہ ریاست میں آگئی ہے۔ دیکھئے سچر کمیٹی رپورٹ/272]۔

شہری ارتکاز

ہندوستانی مسلمانوں کو عام طور پر شہری خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر کے بہت سے مشہور اور تاریخی شہران سے وابستہ ہیں، اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ اعداد وشمار بھی اس خیال کی تائید کرتے ہیں، کل شہری آبادی میں مسلمانوں کا تناسب، کل دیہی آبادی میں مسلمانوں کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ شہری مسلمانوں کی تعداد دیہی مسلمانوں سے زیادہ ہے، (طباعتی اور کہربائی ذرائع ابلاغ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی احساس ہوجائے گا کہ شہری مسلمانوں کے مسائل کو دیہی مسلمانوں کے مسائل کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے)۔ اگر کل مقامی آبادی میں مسلمانوں کے تناسب کا لحاظ کیا جائے تو ہندوستان میں 9 ایسے اضلاع ہیں جہاں مسلمان 75 فیصد یا زائد ہیں، 11 ضلعوں میں ان کی تعداد 50 فیصدی یا اس سے زائد ہے، بقیہ 571 اضلاع میں ان کی تعداد ایک فیصدی سے لے کر 50 فیصدی تک کے درمیان ہے۔ ریاست اتر پردیش میں، جہاں مسلمانوں کا سب سے زیادہ ارتکاز ہے، ایک سروے سے بھی انھیں رجحانات کی تصدیق ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اتر پردیش میں 12 اضلاع ایسے ہیں جن کی کل شہری آبادی میں کل مسلم آبادی کا تناسب 24-13 فیصد ہے، لیکن ایسے 18 اضلاع ہیں جہاں یہ تناسب 40-25 کے درمیان ہے۔ (دیکھیے جدول:1)

غیر زراعتی روزگار

اسی طرح ہم یہ بھی نوٹ کرسکتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں میں غیر زراعتی پیشوں کا

تناسب نسبتاً زیادہ ہے اور اس خاصیت میں دیہی وشہری کا کوئی فرق نہیں۔ نیشنل سیمپل سروے (N.S.S.) کے جمع کردہ اعداد وشمار سے ظاہر ہے کہ کل دیہی مسلم آبادی کا صرف 36 فیصد حصہ اپنا روزگار زراعتی زمرے سے حاصل کرتا ہے، جبکہ ہندوؤں میں یہی تناسب 44 فیصد ہے۔ دوسری اقلیتوں مثلاً عیسائیوں اور دوسرے مذہبی گروہوں میں بھی یہ تناسب مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اسی اعتبار سے غیر زراعتی زمروں میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ''خود روزگاری'' (Self employment) کا تناسب زیادہ ہے کیوں کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ''خود روزگاری'' کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتی ہے۔ شہری علاقوں میں مسلمانوں میں خود روزگاری کا تناسب 53 فیصد ہے جبکہ ہندوؤں میں یہ تناسب صرف 36 فیصد ہے (1)۔

سماجی اور معاشی ترقی کی سطحیں

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان سماجی اور معاشی ترقی کی سطح عام قومی سطح سے کم ہے۔ اب تو اس قیاس کی تصدیق کرنے والے کئی تحقیقی مقالے بھی دستیاب ہیں (2)۔ گوکہ قابل اعتماد اعداد وشمار کا اب بھی قحط ہے، کیونکہ سرکاری اعداد وشمار کی درجہ بندی مذہبی فرقوں کے اعتبار سے نہیں کی جاتی ☆، اس لئے یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ مسلم نوجوانوں کے درمیان بے روزگاری کی شرح کتنی ہے اور ہندو، سکھ یا عیسائی نوجوانوں کی نسبت کم ہے یا زیادہ۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ مسلم نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح قومی شرح کے مقابلہ میں کم ہے یا زیادہ۔ فی الحقیقت، متعلقہ اور قابل اعتبار اعداد وشمار کی غیر موجودگی میں اس قسم کے بیانات کو قیاسات سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ (3)

☆ یہ مقالہ ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی اور معاشرتی حالت پر سچر کمیٹی رپورٹ کی اشاعت سے قبل ہی تحریر کیا جاچکا تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کی زیادہ تر وجوہات تاریخی ہیں، اول تو یہ کہ ہندوستانی مسلمانوں نے جدید مغربی تعلیم اور ٹکنالوجی کو اس سرعت سے اختیار نہیں کیا جیسے ملک کے دوسرے طبقات بالخصوص ہندوؤں نے اسے اختیار کیا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے دوران مغربی تعلیم کے اختیار کرنے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کم از کم 60 سال کا فرق تو ضرور تھا۔ سرسید کا ایم اے او کالج 1875ء میں قائم ہوا، لیکن بنارس کا ہندو کالج اس سے قبل ہی قائم ہو چکا تھا۔ بنگال میں راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک، جو ہندوؤں میں اصلاحِ سماج کا ہراول دستہ سمجھی جاتی ہے، اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہی کافی زور پکڑ چکی تھی۔ اس تاریخی فرق کے نتائج آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ دوم: ایک بڑا تاریخی دھچکہ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم تھا، جب ہندوستان اور پاکستان آزاد ممالک کی حیثیت سے وجود میں آئے۔ تعلیم یافتہ، باصلاحیت، ہنرمند اور فارغ البال مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کرگئی۔ ہندوستان میں جو مسلمان باقی رہ گئے وہ معاشی طور پر کمزور اور سماجی طور پر پسماندہ طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ سوم: ہندوستان میں خاتمۂ زمینداری نے رہی سہی کسر پوری کردی، مسلم زمین داروں کی زمینیں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ چونکہ ان کو متبادل روزگار نہ مل سکا، اور نہ ہی انھوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کیا تھا، اس طرح ایک بظاہر ترقی پسندانہ اقدام ہندوستانی مسلمانوں کے معاشی اور معاشرتی زوال کا پیش خیمہ بنا۔

ان سماجی، سیاسی اور دوسرے اسباب کی بنیاد پر آزاد ہندوستان میں بھی مسلمان، مجموعی طور پر ترقیاتی پروگراموں سے کماحقہ، مستفید نہیں ہو پائے۔ (4) اب بھی وہ غربت اور پسماندگی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

قرض کی دستیابی

قومی کمیشن برائے اقلیات [National Commission on Minorities] نے

اپنی ایک رپورٹ میں کہا کہ ''لاعلمی کی وجہ سے اقلیتی فرقہ کے افراد حکومت کی مختلف ترقیاتی اسکیموں سے کافی استفادہ نہیں کر پاتے، بینکوں سے قرضوں کے حصول میں بھی انھیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے''۔ (5) اپنے اس بیان کی تصدیق کے لئے کمیشن نے ضلع سہارنپور میں اقلیتی فرقوں کو قرضوں کی فراہمی کے بارے میں کچھ اعداد وشمار جمع کئے۔ ملحوظ رہے کہ ضلع سہارنپور میں خاصی بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ کمیشن کو ان اعداد وشمار کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ''1990-91ء کے مالی سال کے دوران سہارنپور شہر میں اقلیتوں کو 66 ملین روپئے قرض دیئے گئے، جب کہ کل قرض کی مقدار 506.07 ملین روپئے تھی۔ اس طرح مسلمانوں کے حصے میں کل قرض کا صرف 13 فیصد آیا، جبکہ سہارنپور شہر کی کل آبادی میں ان کا حصہ 31 فیصدی تھا''۔ (6) (دیکھیے جدول:2)

بینکوں کی خدمات کا کم استعمال

جدول 2 میں دیئے گئے اعداد وشمار سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمان تجارتی بینکوں کا استعمال کم کرتے ہیں۔ قومی کمیشن برائے اقلیات نے ریزرو بینک آف انڈیا سے دریافت کیا کہ مسلمان اور دوسری اقلیات کس حد تک بینکوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ریزرو بینک آف انڈیا کے فراہم کردہ اعداد وشمار کی بنیاد پر جدول 2 ترتیب دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1990-91ء کے مالی سال میں بینکوں کے کل حسابات کی تعداد 30 کروڑ 450 لاکھ 21 ہزار 120 تھی۔ ان میں سے صرف 32 لاکھ 54 ہزار دوسو چھیاسی حسابات مسلمانوں کے تھے جو کل تعداد کا 9.34 فی صدی ہوتا ہے۔ کل قرضوں کا تقریباً 5 فیصد مسلمانوں کو دیا گیا۔ ان اضلاع میں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں آباد ہیں یہ تناسب کچھ زیادہ ہے۔

اس صورت حال کی دو وضاحتیں ممکن ہیں:

۱- اس کا امکان ہے کہ مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہو اور قرض کے لئے ان کی درخواستوں کو عام طور پر رد کر دیا جاتا ہو، تا کہ انھیں ان مالی وسائل سے محروم رکھا جا سکے۔

۲- اس کا بھی امکان ہے کہ مسلمان قرض حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، ظاہر ہے ایسی صورت میں ان وسائل تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ رسائی تو ان لوگوں کی ہی ہو سکتی ہے جو ان وسائل کو پانے کی کوشش کریں اور بینک کے ضابطوں کے مطابق درخواستیں دیں۔

اب موجودہ اور دستیاب اعداد وشمار کی بنیاد پر یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کون سا عامل اس صورت حال کے لئے ذمہ دار ہے۔ قیاس اغلب یہ ہے کہ شاید دونوں عامل ایک ساتھ کارفرما ہوں۔ ان میں کس عامل کا کتنا دخل ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے مزید تفصیلی اعداد وشمار درکار ہوں گے۔ تاہم جدول 2 میں دیئے گئے اعداد وشمار کی بنیاد پر اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں بینک کے استعمال کی شرح بہت زیادہ اونچی نہیں ہے، اس صورت حال کے کئی سبب ہو سکتے ہیں مثلاً فی کس آمدنی کا کم ہونا، عام خواندگی کی کم شرح، اقتصادی پسماندگی اور مذہبی اسباب۔

بہت سے مسلمان اب بھی تجارتی بینکوں سے معاملہ کرنا اس لئے پسند نہیں کرتے کہ تجارتی بینک سود پر لین دین کرتے ہیں اور سود کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے 15-20 کروڑ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس بنا پر بینکوں سے احتراز کرتی ہے۔ اندازہ لگایا ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمان بینکوں کا استعمال کرنے لگیں تو تخمیناً 150 ٹریلین ڈالر کی رقم مالیاتی نظام میں واپس آسکتی ہے، بالفاظ دیگر اگر ہندوستان میں کوئی اسلامی بینک قائم ہو جائے یا اسلامی بینک کاری کی طرف کسی دوسری شکل میں پیش رفت ہو سکے، تو اس رقم کے ایک بڑے حصہ کو معاشی نظام میں واپس لایا جا سکتا ہے۔

اسلامی بینک کاری کی معنویت

اب تک ہندوستان اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات میں ہونے والی تبدیلیوں سے دور دور ہی رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ آئندہ بھی یہ صورت حال بعینہٖ برقرار رہے۔ ہندوستان کے لئے اسلامی بینک کاری اور مالیات کی اہمیت (Significance) اور معنویت (Relevance) مندرجہ ذیل نکات کے ذریعہ واضح کی جاسکتی ہے:

۱- اسلامی بینک کاری کا آغاز اسلامی ممالک میں ہوا، اس وقت اس کا ارتکاز خلیج عربی اور جنوب مشرقی ایشیا کے اُن ممالک میں ہے جو اسلامی کانفرنس تنظیم کے ممبر ہیں۔ مسلمان ہندوستان کی کل آبادی کا ایک معتد بہ اور اہم حصہ ہیں۔ فی الحقیقت ہندوستان کی مسلم آبادی کئی مسلم ممالک کی کُل آبادی سے بھی زیادہ ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی، مسلم ممالک میں ہونے والے سب سے اہم اور دوررس نتائج کی حامل تبدیلی سے مکمل طور پر بے گانہ نہیں رہ سکتی۔

۲- ان ملکوں سے قطع نظر، جہاں اسلامی بینک کاری پورے ملک کی سطح پر حکومت کی طرف سے شروع کی جارہی ہے، اسلامی بینک کاری اور مالیات کے زیادہ تر تجربے نجی زمرۂ کار میں ہوتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں 1969ء سے تجارتی بینک کاری زمرۂ کار کا ایک بڑا حصہ عوامی زمرۂ کار میں لے آیا گیا تھا، جب 14 بڑے بینکوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا تھا۔ تاہم 1990ء کی دہائی میں عالمیت (Globalization) اور کھلے پن (Liberalization) کی پالیسیوں کے تحت غیر ملکی نجی بینکوں اور دیسی نجی بینکوں کو کافی اختیارات دیئے جارہے ہیں، بینک زمرۂ کار کی نجکاری ہندوستان میں کافی عرصہ سے معرض التوا میں ہے۔ نجی زمرۂ کار میں اسلامی بینک کاری کے آغاز سے ہندوستان میں نجی بینک کاری کو فروغ حاصل ہوگا۔

۳- فی الحال ہندوستان میں کسی قابل لحاظ پیمانہ پر سرمایہ کاری بینک (Investment Banks) نہیں ہیں۔ برطانوی روایت کی پیروی کرتے ہوئے نجی زمرۂ کار کے بینک بھی اپنے اعمال کو بینکوں کے روایتی کردار تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اگر ایک اسلامی سرمایہ کاری بینک (Islamic Investment Bank) قائم کیا جا سکے تو اس سے ملک میں سرمایہ کاری بینکنگ (Investment Banking) کو فروغ حاصل ہوگا۔

۴- ہندوستان نے حالیہ زمانہ میں بینک کاری زمرۂ کار کے لئے کھلے پن کی پالیسی اپنائی ہے اور متعدد غیر ملکی بینکوں نے یہاں کام کرنا شروع کر دیا ہے، جیسے ہانگ کانگ بینک (ایچ ایس بی سی)، سٹی بینک، اسٹینڈرڈ چارٹر بینک وغیرہ۔ اگر خلیجی ممالک میں کام کرنے والے اسلامی بینکوں کو ہندوستان میں کام کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے تو ہندوستان میں کافی غیر ملکی سرمایہ مہیا ہوسکتا ہے۔ یہ تو معروف ہے کہ 1995 میں دلہ البرکہ گروپ کو ممبئ میں البرکہ فائنانس ہاؤس قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کا منظور شدہ سرمایہ 50 ملین روپیہ تھا، جس میں سے 30 ملین روپیہ ادا شدہ سرمایہ تھا۔ اس میں 51 فیصد سرمایہ البرکہ نے لگایا تھا اور بقیہ 49 فی صد دیسی سرمایہ کاروں نے مہیا کیا تھا۔ البرکہ فائنانس کارپوریشن کو ہندوستانی قانون کی حدود میں ایک انوسٹمنٹ بینک کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ گو کہ اب ہندوستانی مالی بازار میں اس کا وجود نہیں ہے، تاہم اسلامی بینک، وسیع ہندوستانی بازار میں داخل ہونے کے لئے اس نظیر کا استعمال کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی اہمیت کی کئی کمپنیوں جیسے HSBC، سٹی بینک، ANZ Grindley وغیرہ نے اسلامی بینک کاری میں دلچسپی لینا شروع کی ہے (اے این زی گرینڈلے بینک اب اسٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک کے نام سے کام کر رہا ہے)۔ انھوں نے اسلامی بینک کاری کے لئے بعض ذیلی کمپنیاں قائم کی

ہیں، خاص اسلامی سرمایہ کاری فنڈوں کا اجراء کیا ہے، یا اسلامی شاخیں قائم کی ہیں۔ سٹی بینک نے تو بحرین میں باقاعدہ ایک مکمل اسلامی بینک بھی قائم کردیا ہے۔ HSBC کا HSBC امانت بینک برطانیہ میں فعال ہے۔ ان میں سے بعض کمپنیوں کو ہندوستان میں بھی اس قسم کے اعمال کی اجازت دی جاسکتی ہے، اس قسم کے اقدام سے اسلامی بینک کاری اور ہندوستانی معیشت دونوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

۵- اس حقیقت کے پیش نظر کہ اسلامی بینک کاری غیر سودی بنیادوں پر کام کرتی ہے، معاشی طور پر پسماندہ، غریب اور کمزور طبقات کے لئے اس کی معنویت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ کچھ (Micro Credit Institution) اسلامی بنیادوں پر قائم کئے جاسکتے ہیں اور وہ ہندوستانی سماج کی ضروریات پوری کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

۶- اسٹیٹ بینک آف انڈیا (SBI) ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی بینک ہے، جو زرعی زمرۂ کار کو مناسب اور کم شرح سود پر قرض فراہم کرتا ہے۔ ایسی اطلاعات بھی ملی ہیں کہ بعض حالتوں میں SBI نے صفر شرح سود پر قرض فراہم کئے ہیں۔

۷- ہندوستانی حالات میں غیر سودی امداد باہمی قرض انجمنیں (Interest Free Cooperative Credit Societies) بھی لوگوں کو سود خور مہاجنوں کے چنگل سے بچانے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔

ہندوستان میں اسلامی مالیاتی ادارے

ہندوستان میں بینک کاری کا موجودہ منظرنامہ پیچیدہ، متنوع اور مختلف اقسام کے کنٹرول کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ ہندوستانی بازارِ زر (Money Market) دو روایتی حصوں میں بٹا ہوا ہے، منظم اور غیر منظم، منظم بازارِ زر، نجی، عوامی اور غیر ملکی زمرہ ہائے کار میں فعال

تجارتی بینکوں پر مشتمل ہے، ایک حالیہ سروے کے مطابق ملک میں 97 تجارتی بینک ہیں جن میں سے 32 عوامی زمرے کے بینک ہیں، 27 نجی زمرے کے بینک ہیں اور 38 غیر ملکی بینک ہیں، گو کہ غیر ملکی بینک تعداد میں کافی ہیں، لیکن بازارِ زر میں ان کا حصہ قدرے قلیل ہے، بازار میں شراکت کے نقطۂ نظر سے عوامی زمرے کے بینکوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے (83 فیصد) ان کے بعد نجی بینکوں (9 فیصد) اور غیر ملکی بینکوں (8 فیصد) کا نمبر آتا ہے۔ جمع حاصل کرنے (Deposit mobilization) اور اثاثہ جات کی ملکیت (Ownership of Assets) میں بھی ایسے ہی رجحانات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی بینک کاری کا نظام، انڈین بینکنگ ریگولیشن ایکٹ 1949، ریزرو بینک آف انڈیا ایکٹ 1935, (Negotiable Instrument Act) 1881، کوآپریٹیو سوسائٹیز ایکٹ 1861، اور بینکنگ ریگولیشن ایکٹ 1969 کے ضابطوں کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی قانون میں غیر سودی بینک کاری کے امکان کو تسلیم نہیں کیا گیا، اس لئے جب کبھی بھی ہندوستان میں غیر سودی بینک کاری کا آغاز ہو تو متعلقہ قوانین کی بعض شقوں میں ترمیم لازمی ہوگی۔

ان حالات میں ہندوستان میں فی الحال کسی اسلامی بینک کا وجود نہیں، تاہم اسلام میں حرمت سود کے پیش نظر، ہندوستانی مسلمانوں نے غیر سودی متبادل کی تلاش اپنا فرض سمجھا اور اس سمت میں بہت سی کوششیں کیں۔ بیشتر ان کوششوں نے مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک شکل اختیار کی۔

۱- غیر سودی قرض انجمنیں (Interest Free Credit Societies)

۲- غیر سودی مالیاتی کمپنیاں (Interest Free Financial Companies)

۳- سرمایہ کاری فنڈ (Investment Funds)

غیر سودی قرض انجمنیں (Interest Free Credit Societies)

اسلامی بینکوں کے عدم وجود کی صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے مالیاتی ادارے قائم کیے ہیں، خواہ ان کا پیمانہ کسی قدر چھوٹا کیوں نہ ہو، اور ان کا حجم کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ تخمیناً اس وقت ہندوستان کے طول وعرض میں کم از کم دوسو ایسے ادارے کام کررہے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان اداروں کے بارے میں قابل اعتماد مالیاتی اور شماریاتی تفاصیل کا فقدان ہے، معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی سائنٹفک نظام کا وجود نہیں۔ بعض افراد نے انفرادی طور پر سروے کرنے اور معلومات جمع کرنے کی کوششیں کی ہیں، لیکن ان کوششوں کو بہت کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً ڈاکٹر رحمت اللہ نے 150 اسلامی مالیاتی اداروں کے پتے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ان تمام اداروں کو ایک سوالنامہ ارسال کیا۔ ان میں سے صرف 34 نے جوابات دینے کی زحمت گوارا کی۔ ڈاکٹر رحمت اللہ نے ان نتائج کو ایک تحقیقی مقالہ کی شکل میں شائع کردیا ہے، جس سے ان اداروں کے بارے میں خاصی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ (8)

ڈاکٹر رحمت اللہ نے اپنے مقالہ میں ان اداروں کو ''اسلامی بینک'' قرار دیا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ ''ہندوستان میں یہ غیر سودی ادارے بیشتر وہی اعمال انجام دے رہے ہیں جو عام طور پر روایتی بینک اور بعض ملکوں میں اسلامی بینک انجام دیتے ہیں، اس لئے ان کو ''اسلامی بینک'' کہنا غلط نہیں ہوگا۔'' (9) اس نکتہ پر اوصاف احمد نے اختلاف کیا اور یہ دلیل پیش کی ''ان غیر سودی اداروں کو اسلامی بینک قرار دینا درست نہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان اداروں کے لئے یہ ایک غلط نام ہے (Misnomer)، بلکہ اس سے ہندوستان میں غیر سودی مالی اداروں کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلنے کا اندیشہ بھی ہے''۔ (10) اوصاف احمد نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ اسلامی بینک صرف منافع کمانے والے ادارے نہیں ہیں، وہ قانونی ادارے بھی ہیں جو متعلقہ ممالک کے

کسی قانون کے تحت وجود میں آتے ہیں۔جن ملکوں کے قوانین میں اسلامی بینک کاری کی گنجائش نہیں تھی وہاں نئے قوانین بنائے گئے، یا موجودہ قوانین میں ہی مناسب تبدیلیاں کی گئیں، لیکن ہندوستان میں یہ صورت حال نہیں ہے، جہاں یہ ادارے کسی قسم کی قانونی حمایت کے بغیر ہی کام کرتے ہیں۔ان کو بینک کہنا اس لئے بھی درست نہیں کہ ہندوستان میں ریزرو بینک آف انڈیا کی اجازت کے بغیر کوئی بینک قائم نہیں کیا جاسکتا۔اب اگر یہ کہا جائے کہ یہ ادارے بینکوں کے اعمال انجام دیتے ہیں تو مرکزی بینک ان کے خلاف یہ کہہ کر اقدام کرسکتا ہے کہ یہ بینک غیر قانونی ہیں۔

بہر حال دستیاب معلومات اور اعداد وشمار کے پیش نظر ہندوستان میں غیر سودی مالی اداروں کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں کہی جاسکتی ہیں:

۱- گوکہ غیر سودی بینک کاری کی نظریاتی تشکیل برصغیر میں بیسویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی میں ہی ہوچکی تھی، لیکن غیر سودی مالیاتی اداروں کا وجود بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں ہی عمل آیا۔عموماً ان اداروں کا قیام برصغیر سے باہر ہی ہوا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ ہے جب خلیجی ممالک اور اسلامی کانفرنس تنظیم سے وابستہ دوسرے ممالک میں اسلامی بینک قائم کرنے کی ایک لہر چل رہی تھی۔

۲- موجودہ اطلاعات کے مطابق ہندوستان میں غیر سودی مالی ادارے زیادہ تر جنوبی ریاستوں میں قائم کیے گئے ہیں، جن میں آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالا اور تامل ناڈو شامل ہیں۔شمالی ہند، جہاں ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، ابھی بھی اس تحریک سے مستفید ہونے کو ہے۔

۳- ان اداروں کے قیام کا اصل محرک مذہبی ہی ہے۔ان میں سے زیادہ تر ادارے ان لوگوں نے قائم کیے ہیں جن کا کسی نہ کسی مذہبی جماعت سے براہِ راست یا بالواسطہ

تعلق تھا۔تاہم یہ بھی درست ہے کہ ان اداروں کے قیام اور مسلسل کارکردگی کے پیچھے عام مسلمانوں کی یہ خواہش بھی کارفرما رہی ہے کہ وہ اپنے مالی اعمال غیر سودی بنیادوں پر سرانجام دینا چاہتے ہیں، تاکہ وہ ربا سے آلودہ ہوکر گناہگار نہ ہوں۔ان میں سے بیشتر ادارے فلاحی بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔ان کو تجارتی یا مالیاتی ادارے تسلیم کرنا مشکل ہے، کیونکہ منافع کا حصول، ان اداروں کا بنیادی محرک نہیں ہے۔

۴- ان سوسائٹیوں کا رجسٹریشن مختلف قوانین کے تحت کرایا گیا ہے، بعض کا رجسٹریشن خیراتی اداروں کے طور پر کرایا گیا ہے، بیشتر اداروں کا رجسٹریشن سوسائٹی ایکٹ کے تحت ہوتا ہے، اس لئے وہ رجسٹرڈ سوسائٹی کے نام سے جانی جاتی ہیں، بعض ادارے خیراتی ٹرسٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، جبکہ بعض نے اپنا رجسٹریشن کوآپریٹیو سوسائٹی کی حیثیت سے کرایا ہے۔ان میں تجارتی کمپنیوں کی تعداد بہت کم ہے۔

۵- ان اداروں کے مالیاتی ذرائع میں اداروں کی نوعیت کے لحاظ سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔مثلاً خیراتی اداروں کو ان کے مالیاتی وسائل زکوٰۃ، صدقہ اور دوسرے خیراتی کاموں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔امداد باہمی انجمنوں کو ان کے مالی وسائل ممبروں سے فیس اور جمع کی شکل میں حاصل ہوتے ہیں۔صرف وہ تجارتی کمپنیاں، جن کو اس کی قانونی اجازت ہے، جمع قبول کر کے مالی وسائل حاصل کرسکتی ہیں۔

۶- متعلقہ اعداد وشمار کی عدم موجودگی میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان اداروں کے تحت کتنا سرمایہ موجود ہے، اور کتنی جمع رقم ان کے پاس ہے، اسی سبب سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی زندگی میں ان اداروں کا کیا رول اور کردار ہے۔

۷- ان سوسائٹیوں اور اداروں کا اصل کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممبروں یا عام لوگوں سے رقوم جمع کے طور پر وصول کرتے ہیں اور ان کو ضرورت پیش آنے پر غیر سودی قرض

فراہم کرتے ہیں۔ ان اعمال کی تفاصیل میں مختلف اداروں میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ قرض دینے کے معاملہ کو ہی لیجئے، بعض ادارے یہ خدمت بالکل مفت انجام دیتے ہیں، کچھ ادارے حقِ خدمت (Service Charge) وصول کرتے ہیں، کچھ ادارے قرض دیتے وقت زیورات یا کوئی دوسری قیمتی چیز رہن رکھ لیتے ہیں، جب کہ کچھ دوسرے ادارے شخصی ضمانت کو ہی کافی سمجھتے ہیں، کچھ ادارے بعض اسلامی مالیاتی طریقوں مثلاً اجارہ اور مشارکت وغیرہ پر بھی عمل کرتے ہیں، گوکہ ان اعمال کا دائرۂ کار اور سطح معروف وجوہات کی بنیاد پر محدود ہی رہتا ہے۔

ان اداروں کی کارکردگی کے بارے میں بعض معروضات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں، تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان معروضات کو اسلامی مالیاتی اداروں کی کارکردگی کی قدر و قیمت کا تعین نہیں سمجھنا چاہیے، جس کے لئے تفصیلی اعداد و شمار اور معلومات کی کہیں زیادہ مقدار میں ضرورت ہوگی۔ تاہم محدود معلومات کی بنیاد پر کم از کم یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ:

۱- ان اداروں نے غیر سودی بینک کاری کے تصور کو ایک ایسے ماحول میں مقبول بنانے کا مفید کردار انجام دیا ہے، جو اگر مخالفانہ نہیں ہے تو موافقانہ بھی نہیں ہے۔

۲- ان میں سے بیشتر ادارے غیر منظم زمرۂ کار میں فعّال ہیں، جب کہ غیر منظم زمرے کی دیکھ ریکھ اچھی طرح نہیں کی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عوام الناس کے دلوں میں ان اداروں کی بابت پورا اعتماد بحال نہیں ہوتا اور وہ اپنی جمع رقوم کے تحفظ کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی انجمنیں رجسٹرڈ بھی نہیں ہیں۔ بعض اوقات کچھ طالع آزما لوگ اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر مالی منافع کے حصول میں لگ جاتے ہیں اور دوسروں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں، ان اداروں کے حق میں یہ بہتر ہوگا

کہ کسی مناسب قانون کے تحت اپنا رجسٹریشن کرالیں اور اپنے اعمال میں شفافیت (Transparency) اور جواب دہی (Accountability) کے عناصر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

غیر سودی مالیاتی کمپنیاں

غیر سودی مالیاتی تجارتی اداروں کی ایک دوسری شکل مالیاتی اور سرمایہ کاری کمپنیاں ہیں جو اپنا کاروبار غیر سودی بنیادوں پر کرتی ہیں، ہندوستان میں یہ کمپنیاں منظم بازار میں کام کرتی ہیں اور ان کا رجسٹریشن ضروری ہے۔ اس رجسٹریشن کے باعث، ان کمپنیوں کو اپنے پیش رووں کی بہ نسبت عوام کا زیادہ اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ فی الحال اس قسم کی کمپنیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے تاہم ذیل میں دو اہم کا تذکرہ کیا جاتا ہے گو کہ ان میں سے اول الذکر (الامین کارپوریشن) اب بند ہو چکی ہے:

۱- الامین اسلامک فنانشیل اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ

۲- النجیب ملی میچوئل بنی فِٹ فنڈ لمیٹڈ

الامین اسلامک فنانشیل اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن

[Al-Ameen Islamic Financial & Investment Corporation]

الامین اسلامک فنانشیل اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن (AIFIC) ایک زمانے تک ہندوستان میں سب سے بڑا اور اہم اسلامی مالیاتی ادارہ تھا۔ اس کا صدر دفتر جنوبی ہند میں ریاست کرناٹک کے صدر مقام بنگلور میں واقع تھا۔ ہندوستان میں یہ واحد مالیاتی کمپنی تھی جو ایک شرعی بورڈ کی نگرانی میں اپنے اعمال انجام دیتی تھی، اس کمپنی کا منظور شدہ سرمایہ 100 ملین

روپیہ رکھا گیا تھا جس کو دس دس روپے کے 10 لاکھ حصص میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں سے 52,390.00 کے حصص جاری کئے گئے، خریدے گئے اور اداشدہ بنے۔

کارپوریشن کا رجسٹریشن 1956ء کے کمپنی ایکٹ کے تحت کرایا گیا، کارپوریشن کا خاص کاروبار گاڑیوں، صنعتی اوزار ومشینری اور عمارتوں کو کرائے پر دینا تھا، اس کمپنی کو ریزرو بینک آف انڈیا نے ایک لیزنگ کمپنی (Leasing Company) کے طور پر تسلیم کر رکھا تھا۔ اس کمپنی کو غیر بینک کاری مالیاتی ادارے (Non-Banking Financial Institution, NBFI) کی حیثیت حاصل تھی، NBFI ہونے کی حیثیت سے کارپوریشن کو جمع قبول کرنے کا اختیار ہے، ایک لائسنس یافتہ جمع قبول کرنے والے (Licensed Deposit Taker) ادارے کی حیثیت سے کارپوریشن نے اپنے گاہکوں کے درمیان جو عام طور پر غریب مسلمان ہیں، بچت اور سرمایہ کاری کی عادت کو فروغ دینے کے لئے مختلف قدم اٹھائے ہیں۔

کمپنی کے اعمال

گوکہ الامین کمپنی کی عملی تجارت اب بند ہو چکی ہے تاہم اس کے تجارتی اعمال کو یہاں قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ ہندوستان کی حد تک یہ واحد تجارتی کمپنی تھی جو مزعومہ طور پر یہ دعوی کرتی تھی کہ اس کے تجارتی اعمال شریعت سے متصادم نہیں ہیں:

۱- کمپنی عام طور پر "کرایہ" کو ایک مالیاتی آلے (Financing Tool) کی حیثیت سے استعمال کرتی تھی، اس مقصد کے لئے کئی لیزنگ اسکیمیں وضع کی گئی تھیں، کرایہ کا بنیادی معاہدہ 5-3 برس کا ہوتا تھا۔ بعض حالتوں میں اثاثہ کے لین دار (Lessee) کو اثاثہ کی قیمت کا کچھ فیصد حفاظتی جمع (Security Deposit) کے طور پر جمع کرنا ہوتا تھا۔ کرایہ کی مدت کے دوران اثاثہ کا لین دار، دین دار کو طے شدہ ماہانہ کرایہ ادا کرنے کا پابند تھا۔

۲- کمپنی مرابحہ کی بنیاد پر دیرپا اشیائے صرف (Durable Consumer Goods) کی خریداری کے لئے مالیات کا انتظام کرتی ہے، چنانچہ کمپنی مرابحہ کے معروف طریقہ کے مطابق دیرپا اشیاء صرف خریدتی اور طے شدہ منافع پر گاہکوں کے ہاتھ ادھار فروخت کرتی تھی۔

۳- کمپنی صنعتی، تجارتی اور دوسرے مشروعات کو نفع میں شرکت (Profit Sharing) کی بنیاد پر مالی اعانت فراہم کرتی ہے۔ مشروع کے مختلف پہلوؤں کی چھان بین کے بعد کمپنی گاہکوں سے منافع کی شرح اور اعانت کی مقدار طے کرتی ہے۔ عموماً یہ مذاکرات براہ راست سرمایہ کاری یا مشارکت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

۴- ایک منصوبہ کے تحت غریبوں اور معاشی طور پر کمزور طبقات کے لئے گھر بنانے کی خاطر مالیات کا اہتمام کیا جاتا تھا، اس منصوبہ کے تحت گاہک کے نام پر ایک بچت کھاتہ کھولا جاتا تھی، اور تین سال تک اس کی بچت اس کھاتے میں جمع کی جاتی تھی، تین سال بعد گاہک ادارے سے اپنی کل جمع رقم کا دوگنا قرض کے طور پر حاصل کر سکتا تھا۔ قرض کی حد دولاکھ روپئے مقرر کی گئی تھی۔ قرض کو سات سال کے عرصہ میں یکساں ماہانہ قسطوں میں ادا کرنا ہوتا تھا۔ قرض پر کوئی اور رقم وصول نہیں کی جاسکتی۔

۵- کمپنی ہندوستانی کمپنی ایکٹ 1956ء کے ضابطوں کے تحت رقوم جمع کے لئے قبول کرتی تھی، جمع کنندہ کو کمپنی کے منافع اور ہر اس بونس میں شرکت کا حق تھا جس کا اعلان کمپنی وقتاً فوقتاً کرتی رہتی تھی۔

۶- دستیاب اعداد و شمار کے مطابق 95-1994ء میں مضاربت جمع کی مقدار 94.1 ملین روپئے تھی۔ 96-1995 میں یہ جمع رقوم بڑھ کر 104.5 ملین روپئے ہوگئیں، لیکن 97-1996ء میں جمع رقوم گھٹ کر 100.6 ملین ہوگئی تھیں، جب کہ 96-1995 میں

بڑھ کر 104.5 ملین ہوگئی، ایک بار پھر گھٹاؤ کا رجحان دیکھا گیا لیکن 98-1997 میں جمع رقوم 131.0 ملین تک پہنچ گئیں۔

۷- الامین کارپوریشن میں جمع ہونے والی رقوم کوئی طرح کے کھاتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا مثلاً: بچت کھاتے، مسلسل کھاتے (Recurring Deposit)، ثابت کھاتے (Fixed Deposit) مضاربت کھاتے، بزرگ شہری کھاتے (Senior Citizen Deposit)، پنشن کھاتے، منافع نقد سرٹیفکٹ، دوبارہ سرمایہ کاری (Reinvestment) کھاتے، قرض سے جڑے کھاتے، وغیرہ۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ کسی ایک وقت میں سارے کھاتے چالو ہوں۔

۸- کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کو اختیار تھا کہ وہ جمع کے لئے نئی اسکیمیں جاری کرسکے۔ بورڈ نے اختراعات کے ذریعہ نئی اسکیمیں وضع کی تھیں، مثلاً حج اور عمرہ کھاتے، ان کھاتوں میں رقم اس لئے جمع کی جاتی تھی کہ بعد میں بچت کاران سے حج اور عمرہ کے اخراجات پورے کرسکیں۔ اسی طرح الامین نے اقراء ڈپازٹ اسکیم کے نام سے ایک جمع اسکیم جاری کی تھی جس کا مقصد تعلیمی اخراجات کی کفالت تھا۔ تحفہ ڈپازٹ اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو بچت اور سرمایہ کاری کی طرف رغبت دلائی جائے۔

۹- الامین کارپوریشن چھوٹے اور غریب بچت کاروں کے لئے بھی وقتاً فوقتاً مختلف اسکیموں کا اجراء کرتا رہتا تھا۔ مثلاً آٹو رکشا والوں کے لئے ایک اسکیم جاری کی گئی، جو شخصی ضمانت پر 15,000 روپیہ تک کا قرض حاصل کرسکتے تھے۔ یہ رقم ایک آٹو رکشا خریدنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ خریداری کے بعد ڈرائیور کو آٹو رکشا الامین کے

پاس رہن (Mortgage) کرنا ہوتا تھا۔ ڈرائیور کو یہ رقم ایک ہزار دنوں (33 ماہ) میں Rs. 15/- یومیہ کے حساب سے ادا کرنا ہوتی ہے۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ ڈرائیور اتنی رقم اپنی روزانہ آمدنی میں سے آسانی سے دے سکتے ہیں۔ پوری رقم کی ادائیگی کے بعد آٹو رکشا کی ملکیت ڈرائیور کے نام کردی جاتی تھی۔

النجیب ملی میچوئل بینفٹ فنڈ لمیٹڈ

(Al-Najeeb Milli Mutual Benefit Fund Ltd.)

یہ ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی ہے جس کا قیام 1990ء میں عمل میں آیا۔ 1993ء میں حکومت ہند نے اسے ایک میچوئل فنڈ کمپنی کی حیثیت سے تسلیم کیا (جسے ہندی میں ندھی کہتے ہیں)۔ اس طرح اب اس کمپنی کو بغیر کسی حد اور رکاوٹ کے جمع رقوم قبول کرنے کے اختیارات حاصل ہوگئے ہیں۔ اس فنڈ کی شاخیں یوپی، دہلی اور ممبئی میں قائم ہیں اور اس کی جمع رقوم 165 ملین روپئے تک پہنچ چکی ہیں۔ فنڈ نے مختلف قسم کی جمع اسکیمیں جاری کی ہیں۔ مثلاً فوری جمع کھاتہ (Spot Deposit Account) اور جمع منافع کھاتہ (Deposit Benefit Account)۔ ان اسکیموں میں کھاتہ کھولنے کے لئے النجیب کا ممبر بننا ضروری ہے۔ فوری جمع کھاتہ چھوٹے بچت کاروں کے لئے ہے، اس کا مقصد چھوٹے بچت کاروں میں بچت کے رجحان کو فروغ دینا ہے۔ کمپنی کے مقرر کردہ نمائندے بچت کاروں سے براہِ راست جمع وصول کرتے ہیں، بچت کاروں کے لئے کھاتہ میں ایک کم از کم رقم (Minimum Balance) کا رکھنا ضروری ہے۔ بچت کاروں کو ان کی جمع رقوم پر کسی طرح کا منافع نہیں ادا کیا جاتا۔ جمع منافع کھاتہ اسکیم (Deposit Benefit Scheme) کے تحت بچت کار Rs. 40/- یومیہ یا ایک ہزار روپیہ ماہانہ ساڑھے پانچ مہینہ کے لئے جمع کرسکتے ہیں۔ جب یہ رقم ساڑھے پانچ ہزار Rs. 5.500/- یا اس کی کئی گنا (جیسے دوگنا، تین گنا) ہوجائے تو اس کو اسٹاک مارکٹ میں

کمپنیوں کے حصص میں لگادیا جاتا ہے، کمپنی سونے کے زیورات رہن رکھ کر معمولی حق الخدمت کے عوض غیر سودی قرض بھی فراہم کرتی ہے۔

سرمایہ کاری فنڈز (Investment Funds)

گذشتہ بیس پچیس سال سے مالیاتی بازاروں میں اس رجحان کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بینکوں میں رکھی گئی جمع رقوم میں اس تیزی سے اضافہ نہیں ہورہا ہے جس تیزی سے میچوئل فنڈ، سرمایہ کاری فنڈ، اور پنشن فنڈ وغیرہ میں ہورہا ہے۔ حالیہ برسوں میں اسلامی سرمایہ کاری فنڈ کی تعداد، اوران کی رقوم میں بھی معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ابھی تک کسی اسلامی انوسٹمنٹ فنڈ کا وجود میں آنا نہیں سنا گیا۔ اس کا بنیادی سبب ہندوستانی مسلمانوں کی عام اقتصادی پسماندگی ہوسکتی ہے، جس نے انھیں مالیاتی بازاروں میں کسی اہم رول کی ادائیگی سے روک رکھا ہے، حالانکہ گذشتہ برسوں میں بیرون ملک روزگار، خصوصاً خلیجی ممالک میں روزگار، کے نتیجہ میں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک حصہ مالیاتی بازاروں میں سرمایہ کاری کے لائق بن چکا ہے، لیکن عام مسلمانوں کی طرح اس طبقہ کو بھی موجودہ مالیاتی بازار کے بارے میں شدید تحفظات ہیں کہ زیادہ تر مالیاتی طریقے ربا سے ملوث ہیں۔ بجا طور پر ان کی خواہش ہے کہ وہ اپنے مال کی سرمایہ کاری ایسے انداز میں کریں کہ ان کے مال سے حاصل ہونے والا فائدہ جائز ہو اور حرام طریقوں سے اس کا مس نہ ہو۔

تاہم بازار میں کچھ زیادہ غیر سودی متبادل بھی نہ تھے، عرصہ دراز تک مالی سرمایہ کاری (Financial Investment) کے صرف دو طریقے ہندوستانی بازار میں موجود تھے، یا تو بینکوں کے ثابت کھاتوں میں جمع رقم کروائی جائے (Fixed Deposit) ورنہ بازار حصص (Stock Market) سے کمپنیوں کے حصص خریدے جائیں۔ چھٹی دہائی کے وسط میں حکومت ہند نے ایک اسکیم کا اجراء کیا جو اپنی شکل اور کارکردگی میں میچوئل فنڈ سے ملتی جلتی تھی۔ اس اسکیم کا نام یونٹ ٹرسٹ

آف انڈیا(Unit Trust of India) تھا،لیکن اس کوUTI کے مخفف نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ کمپنی اپنے Units پبلک کو فروخت کرتی اور یافت کی سرمایہ کاری مختلف دوسری کمپنیوں کے حصص میں کی جاتی، اس طرح یونٹ میں لگنے والے سرمایہ کا منافع دراصل ان صنعتوں کی کارکردگی پر منحصر ہوگا جن میں یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا نے سرمایہ کاری کی ہے۔ چونکہ UTI سے ملنے والا منافع تغیر پذیر(Variable) ہے،اس لئے بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ UTI میں سرمایہ کاری اسلامی سرمایہ کاری کے بے حد قریب ہوسکتی ہے۔ گو کہ اس ضمن میں بعض اہم قضایا کا نپٹایا جانا ابھی باقی ہے۔ شروع میں توUTI متوقع منافع کا اعلان نہیں کرتا تھا،لیکن جلد ہی UTI نے گذشتہ سال کے تجربہ کی روشنی میں آئندہ سال کے لئے متوقع منافع کی شرح کا اعلان کرنا شروع کردیا، ایک دوسری دشواری یہ ہے کہ UTI کی سرمایہ کاری کو ان صنعتوں اور ان اشیاء سے دور رکھنے کی کوئی صورت نہیں جن کو اسلامی شریعت ممنوع قرار دیتی ہے۔ چنانچہ ان اسباب کی بناء پر مسلمانوں کے ذہنوں میں یونٹ میں سرمایہ کاری کے بارے میں بھی شبہات اور تحفظات پیدا ہوگئے۔

حصص کی سرمایہ کاری اور اسٹاک مارکٹ میں وسعت کے ساتھ صورت حال اب کسی قدر بہتر ہوئی ہے، اسلامی اقدار میں ایمان رکھنے والے سرمایہ کار کے لئے حصص میں سرمایہ کاری (Equity Investment) ایک بہتر متبادل سمجھا جاتا رہا ہے۔ گو کہ گذشتہ کئی برسوں میں ہندوستانی مالیاتی بازار میں سرمایہ کاری فنڈوں اور باہمی فنڈز کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے، لیکن یہ فنڈ بھی مسلم سرمایہ کاری کی مشکلات کے حل میں چنداں مفید نہیں ثابت ہوئے، اول تو ان میں سے بیشتر فنڈ اپنے مالی وسائل کا معتد بہ حصہ سرکاری تمسکات (Government Securities) میں لگاتے ہیں، جن میں گو سود کی شرح کم ہوتی ہے لیکن حکومتی ضمانت کے باعث پیسہ محفوظ رہتا ہے۔ دوم یہ کہ ان فنڈز کو ان صنعتوں سے ابھی کوئی گریز نہیں ہے جن کو مسلمان اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے ممنوع سمجھتے ہیں۔

1995ء میں ٹاٹا میچوئل فنڈ نے ٹاٹا کور سیکٹر ایکویٹی فنڈ کا اجراء کیا۔ مختلف اسلامی مالیاتی

اداروں نے اس فنڈ کے فروغ اور بازار کاری (Marketing) میں حصہ لیا۔ ان اداروں کی کوششوں کے نتیجہ میں ٹاٹا نے اس فنڈ کو اس طرح وضع کیا کہ مسلم سرمایہ کاروں اور دوسرے اخلاقی سرمایہ کاروں (Ethical Investers) کے تحفظات کا خیال رکھا جائے۔ فریقین میں یہ طے پایا کہ اس فنڈ کے ذریعہ حاصل ہونے والے سرمایہ کی سرمایہ کاری، سودی قرضے دینے کے لئے یا ان کمپنیوں میں نہیں کی جائے گی جو اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کرتی ہوں، مثلاً جو شراب سازی یا لحم خنزیر کی پیداوار وغیرہ میں شریک ہوں۔ یہ بھی طے پایا کہ اس فنڈ کے ذریعہ حاصل ہونے والا سرمایہ بنیادی ڈھانچہ اور کلیدی اہمیت کی صنعتوں میں ہی لگایا جائے گا، جیسے سمینٹ، لوہا، فولاد، قوت، کیمیاوی اشیاء، انجینئرنگ، کیمیاوی کھاد، پٹرو کیمیکل، موٹر کار، اتصالات وغیرہ۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر خلیجی ممالک میں بھی مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر اس فنڈ کی خریداری کی۔ شروع کے برسوں میں معیشت کی کساد بازاری کے سبب اس فنڈ کی کارکردگی امیدوں کے مطابق نہیں رہی، تاہم بعد کے برسوں میں اس میں خاصی بہتری واقع ہوئی۔

ہندوستان میں اسلامی مالیات کے امکانات

ہم اس کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ ملک میں اس وقت کئی طرح کے اسلامی مالیاتی ادارے موجود ہیں، مثلاً کریڈٹ سوسائٹی، یا قرض انجمنیں، اسلامی مالیاتی کمپنیاں اور سرمایہ کاری فنڈ وغیرہ، اس ضمن میں اب یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی بینک کاری اور مالیات کے امکانات کیا ہیں، اور اس کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے؟

ہندوستان میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ یہاں کے مسلمان بہت دن تک اسلامی مالیات سے بے گانہ رہ سکیں گے۔ اس مقالہ کے پہلے حصہ میں بیان کئے گئے اداروں اور ان کے اعمال سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان، غیر سودی

مالیات اپنانے کی خواہش میں کسی دوسرے ملک کے مسلمانوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ فی الوقت ہندوستان میں کسی اسلامی بینک کا وجود نہیں ہے، بجز اس کے کہ خلیج کے ایک اسلامی بینک کو ممبئ میں ایک شاخ کھولنے اور چلانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلامی بینک کاری کے لئے ہندوستان کے دروازے مستقلاً بند ہیں کبھی کھل بھی نہیں سکتے۔ بیرونی مما لک میں اسلامی بینک کاری کی کامیابی، اور اندرونِ ملک مسلمانوں کی بڑی تعداد، دو ایسے عوامل ہیں جو ہندوستان میں اسلامی مالیات کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور اس امکان کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہندوستان میں غیر سودی بینک قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جہاں اگر کسی اقدام کے حق میں عام رائے (Public opinion) معتد بہ تعداد میں ہموار کی جائے تو حکومت کو اس مجوزہ اقدام کے حق میں قانونی انتظام کرنا ہی ہوگا۔ ابھی اس امکان کے بارے میں مزید پیش قیاسی کرنا قبل از وقت ہوگا، تاہم دو امکانات تو واضح ہیں، یہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں حکومت کی اجازت سے مناسب قانونی تحفظ کے ساتھ ایک اسلامی بینک قائم ہو اور اس بینک کو مجاز کیا جائے کہ وہ مختلف علاقوں میں اپنی شاخیں قائم کر سکے۔ دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ ملیشیا کا تتبع کرتے ہوئے موجودہ تجارتی بینکوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ وہ ایک غیر سودی کاؤنٹر قائم کریں۔

اس کے ساتھ ہم یہ بات زور دے کر کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ملک کے نظام بینک کاری کا جزء بنایا جانا چاہیے۔ اب تک وہ اس نظام سے باہر ہی رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ترقی کی کوششوں سے وہ بے گانہ رہ جاتے ہیں اور مالیات (Finance) سے محروم رہتے ہیں جو کہ پیداوار کا ایک اہم عامل (Factor) ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے 200 سے زائد غیر سودی قرض انجمنیں (Credit Societies) قائم کی ہیں جو ملک کے طول وعرض میں موجود ہیں۔ یہ انجمنیں

مالی وسائل مہیا کرنے اور غیر سودی قرض فراہم کرنے کے میدان میں فعال ہیں۔ ان میں سے بعض انجمنیں مثلاً مسلم فنڈ نجیب آباد، اور بیت النصر سوسائٹی کافی بڑے اداروں میں تبدیل ہو چکے ہیں (افسوس کہ بیت النصر سوسائٹی بوجوہ اپنے اعمال بند کر چکی ہے)، ان تمام مالیاتی اداروں کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ یہ مناسب قانونی اجازت اور قانون کی کسی حمایت کے بغیر کام کرتے ہیں، چنانچہ جب ان پر برا وقت پڑتا ہے تو ان کے پاس اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ اپنے دروازے بند کریں اور عوام الناس سے اجازت چاہیں۔ ان انجمنوں کے حق میں بہتر یہ ہوگا کہ وہ پہلی فرصت میں اپنا رجسٹریشن کرالیں، خواہ یہ رجسٹریشن آف سوسائٹیز ایکٹ کے تحت ہو یا کوآپریٹیو سوسائٹیز کے تحت۔

اسی طرح ان فنانس کمپنیوں کو بھی، جو اسلامی انوسٹمنٹ کمپنیوں کے طور پر کام کر رہی ہوں، قانونی حفاظت اور حمایت درکار ہے۔ فی الحقیقت ہندوستان جیسے ممالک میں کام کرنے والی اسلامی انوسٹمنٹ کمپنیوں کو دوہرے قانونی نظام کی ضرورت ہے۔ اول تو ان کو شرعی نگراں بورڈ کی ضرورت ہوگی جو اس بات کا خیال رکھے کہ اس کمپنی کے اعمال شریعت کے مطابق ہیں، اس سے عوام کے درمیان اس کمپنی کے بارے میں اعتماد بحال ہوگا، دوم کمپنیوں کو ملکی قاعدہ وقانون کی پابندی کرنی چاہیے۔ جو بھی کمپنی قائم ہو وہ ملکی قانون کے تحت قانونی طریقہ سے قائم ہو، تاکہ اگر ضرورت پڑے تو کمپنی قانون کا سہارا لے سکے۔ قانونی حمایت سے کمپنی کے دوسرے مفادات کا تحفظ بھی ہو سکے گا۔

اس ضمن میں ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان اداروں کی مناسب اور صحت مند ترقی اور افزائش کے لئے ایک اچھا ماحول پیدا کرنے کی غرض سے مالیاتی حکام، پالیسی سازوں اور فیصلہ سازوں کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی جانب مبذول کرانا مفید ہوگا:

۱- مالیاتی حکام اور پالیسی سازوں نے اب تک غیر بینکی مالیاتی کمپنیوں

(Non-banking Financial Institution) کے بارے میں کسی مربوط پالیسی کا اظہار نہیں کیا۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں غیر سودی بنیادوں پر کام کرنے والوں کو NBFI ہی قرار دیا جاتا ہے۔ ان غیر بینکی مالیاتی اداروں پر نافذ ہونے والے قانونی ضابطے اب سے کئی سال پہلے جاری کئے گئے تھے۔ گذشتہ برسوں کے اندران کمپنیوں کی تعداد، اور ان کے اعمال میں کافی اضافہ ہوگیا ہے جس کے باعث ان ضابطوں کی جدید کاری ضروری ہوگئی ہے۔

۲- ان غیر بینکی مالیاتی اداروں کی نگرانی ریزرو بینک آف انڈیا کے سپرد ہے، جو ان سے نسبتاً سختی سے معاملہ کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ ان اداروں سے متعلق ضابطوں میں کچھ نرمی لائی جائے۔

۳- قانون کا تقاضہ ہے کہ یہ ادارے اپنی کل سرمایہ کاری کا کم از کم 15 فیصد سرمایہ، سرکاری تمسکات (Government Securities) میں لگائیں۔ یہ سرکاری تمسکات عام طور پر سودی ہوتے ہیں، ان کمپنیوں کو جو غیر سودی بنیادوں پر کام کرتی ہیں، اس شرط سے بری کر دینا چاہیے، یا ان اداروں سے ایسی سرمایہ کاری کرائی جائے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر سودی ہو، مثلاً ان کمپنیوں سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بنیادی اور کلیدی اہمیت کی صنعتوں کے سرمایہ میں شرکت کریں۔

۴- غیر بینکی مالیاتی اداروں (NBFI) کو عام طور پر اراضی میں سرمایہ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ غالباً اس کا مقصد آراضی میں سٹے بازی کو روکنا ہے، جس کا ہندوستان میں خاصا رواج ہے، تاہم اس پابندی سے ان اداروں کے منافع کمانے کا ایک موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مناسب تحفظات کے ساتھ ان اداروں کو اراضی میں سرمایہ کاری کی اجازت ہونی چاہیے۔

امید کی جاتی ہے کہ یہ اقدامات ان غیر بینکی مالیاتی اداروں کے لئے بھی مفید ہوں گے جواپنا کاروبار غیر سودی بنیادوں پر چلاتے ہیں، خواہ وہ منظم زمرے میں ہوں یا غیر منظم زمرے میں، تاہم ان اداروں کو مندرجہ ذیل باتوں کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

شفافیت (Transparency)

تمام اسلامی مالیاتی اداروں کو اپنے گاہکوں اور عام لوگوں کے تئیں شفاف ہونا چاہیے، اس سے عوام الناس میں ان اداروں کے لئے اعتماد بحال ہوگا۔ اس ضمن میں شفافیت کا رول دوہرا ہونا چاہیے، اول تو یہ یقین دہانی کرنے کے لئے کہ شرعی اصولوں کی فی الواقع پابندی کی جارہی ہے اور اس سلسلہ میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا جارہا، دوسرے اس یقین دہانی کے لئے کہ محفوظ مالیاتی انصرام (Sound Financial Management) کے تمام اصولوں کی پابندی بھی کی جارہی ہے اور جمع کاروں کی رقم محفوظ رہے گی۔ ان مقاصد کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارے اپنے حسابات کی باقاعدہ جانچ پڑتال (Audit) کسی اچھے Auditor سے کرائیں اور ہر سال اپنے مالی حسابات (Financial Accounts) شائع کریں۔

پیشہ ورانہ انصرام (Professional Management)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض پر جوش نوجوان ربا سے نجات پانے کی غرض سے کوئی اسلامی مالیاتی ادارہ قائم کر بیٹھتے ہیں، لیکن ان کے پاس مالی معاملات کو چلانے یا سلجھانے کی پیشہ ورانہ تعلیم اور تجربے کا فقدان ہوتا ہے، اس لئے اکثر وبیشتر وہ ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں جن کا انجام ادارہ کی تباہی ہوتا ہے، اس تباہی کے لئے اسلامی بینک کاری اور اسلامی اصولوں کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری ناتجربہ کاری اور مہم جوئی پر ہے نہ کہ اسلامی اصولوں پر۔

چونکہ بینک کاری اور مالیات میں دوسرے لوگوں کا مال لگا ہوتا ہے، اس لئے ان معاملات میں حد درجہ احتیاط اور تحمل سے کام لینا چاہیے، جہاں تک ممکن ہو سکے مالی معاملات کو ایسے لوگوں کے مشورے سے چلایا جانا چاہیے جن کو ایسے معاملات کا پیشہ ورانہ تجربہ ہو اور انھوں نے اس کی پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کی ہو، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مالیاتی ادارہ کی کارکردگی اور پیدا آوری میں اضافہ ہوگا۔

اسلامی مالیاتی اداروں کے لئے ان اصولوں کی پاسداری اور پابندی اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ ادارے اسلام کے پاک نام پر چلائے جاتے ہیں۔ اگر یہ ادارے ان اصولوں اور اقدار کی پابندی نہ کریں اور مالی تباہی کا شکار ہو جائیں تو اس کی کچھ ذمہ داری اسلامی بینک کاری و مالیات کے سر بھی جاتی ہے۔ (15) اس قسم کے احتمالات سے سختی سے گریز لازم ہے۔

خلاصۂ کلام

اسلامی بینک کاری اور مالیات کی بنیاد حرمتِ ربا پر قائم ہے، دوسرے تمام اسلامی احکامات کی طرح حکم ربا بھی زمان ومکان سے ماورا ہے، اس کا اطلاق دنیا کے تمام ممالک کے مسلمانوں پر ہر حال میں ہوگا۔ بعض ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں پائے جاتے ہیں اکثر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اقلیت میں ہونے کے سبب مسلمانوں کو ان ممالک میں مالی پالیسیوں اور مالیاتی اداروں کا رخ تبدیل کرنے کا اختیار نہیں، اس لئے اقلیتی ممالک میں حرمت ربا کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے۔

تاہم یہ دلیل قابل قبول نہیں، ان ممالک میں جہاں مسلم اقلیتیں موجود ہیں، وہ صدیوں سے حرمت ربا کے حکم کو بسر وچشم تسلیم کرتی آ رہی ہیں۔ علماء کی رائے میں فقہ میں ایسی کوئی بنیاد نہیں جس کی بناء پر مسلم اقلیتی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو ربوی معاملات کرنے

کی اجازت دی جا سکے۔ مسلم اقلیتی ملکوں میں رہنے والے مسلمان شریعت کے اسی طرح پابند (مکلّف) ہیں جیسے مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمان۔

اس اصول کو تنظیم اسلامی کانفرنس کے باہر بھی تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مسلم اقلیتیں بھی ربا سے احتراز کرنے اور نجات پانے کی اتنی ہی متمنی ہیں جتنے کہ مسلم اکثریتی ممالک کے مسلمان یہ خواہش رکھتے ہیں۔ گذشتہ دو دہائیوں میں یہ بات قطعی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں اسلامی بینک کاری کے ارتقاء سے بھی اس خواہش کو تقویت پہنچی ہے، اب اقلیتیں بھی اسلامی بنک قائم کرنے کی خواہش مند ہیں تا کہ وہ بھی ربا سے نجات حاصل کرسکیں۔

ہندوستانی مسلمان اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، وہ بھی اپنے مالی معاملات میں ربا کا عمل دخل نہیں چاہتے۔ ہندوستان میں کم وبیش 15-20 کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے، گو کہ تاریخی اسباب کی بناء پر ہندوستانی مسلمانوں کو اتنی سماجی اور معاشی قوت حاصل نہیں ہے جو اتنی بڑی تعداد کی وجہ سے ان کو حاصل ہونی چاہیے۔ اندیشہ ہے کہ ان کی فی کس آمدنی، قومی فی کس آمدنی سے کافی نیچے ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی شرح خواندگی، دوسرے طبقات سے کہیں کم ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی پسماندگی کہ ایک وجہ، من جملہ دوسری وجوہات کے، یہ بھی ہے کہ عام طور پر بینک کاری سہولیات تک ان کی رسائی نہیں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ربا کے اندیشہ کی وجہ سے وہ موجودہ بینکوں سے بھی کما حقہ استفادہ نہیں کر پاتے۔

ربا سے احتراز کرنے اور نجات پانے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے مختلف علاقوں میں مقامی سطح پر بہت سے ادارے قائم کئے ہیں۔ ان اداروں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، کہیں ان کو کریڈٹ سوسائٹی کہا جاتا ہے اور کہیں بچت ایسوسی ایشن یا مسلم فنڈ، یا اسلامی فنڈ یا بیت المال وغیرہ، لیکن ان کا بنیادی کام ایک ہی ہے: ان لوگوں سے جو ربا میں نہیں پڑنا چاہتے، جمع

وصول کرنا، انھیں بچت کی ترغیب دینا، اور ضرورت پڑنے پر ان کے لئے غیر سودی قرض کا انتظام کرنا، ان میں سے بہت سی انجمنیں یہ کام صرف اپنے ممبروں کے لئے ہی انجام دیتی ہیں۔ اس طرح یہ امداد باہمی انجمنوں کے مماثل بن جاتی ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت سی انجمنوں نے اپنا رجسٹریشن، رجسٹریشن آف کوآپریٹیو سوسائٹیز ایکٹ کے تحت نہیں کرا رکھا ہے۔ اگر یہ انجمنیں اپنے آپ کو کوآپریٹیو نظام کے تحت پھر سے منظم کرسکیں تو ان کو بعض ایسے حقوق اور فائدے حاصل ہوسکتے ہیں جن سے وہ فی الوقت محروم ہیں۔ ان میں سے بعض انجمنیں تو ایسی ہیں جنھوں نے کسی بھی قسم کا کوئی رجسٹریشن نہیں کرایا، اپنے اس طرزعمل سے ان انجمنوں نے اپنے آپ کو مختلف خطروں سے دوچار کردیا ہے۔ یہ ان کے اپنے مفاد میں ہوگا کہ وہ کسی نہ کسی مناسب قانون کے تحت رجسٹریشن کرالیں تاکہ فریقین کو اعتماد حاصل ہو۔

یہ انجمنیں عام طور پر جو قرض فراہم کرتی ہیں وہ کسی نہ کسی مصیبت یا ناگہانی آفت کے وقت ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کے قرض کو انگریزی میں Distress Loan کہتے ہیں، یہ قرض فراہم کرکے ایسی انجمنیں معاشرہ کی ایک اہم خدمت سرانجام دیتی ہیں۔ اگر غیر سودی بنیادوں پر یہ قرض مہیا نہ ہوں تو یہ یقینی ہے کہ قرض دار کسی نہ کسی مہاجن کے چنگل میں پھنس جائے گا، جہاں اسے بے حساب سود دینا پڑتا ہے، ان قرضوں میں سے بہت کم قرضے تجارتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ان میں سے بعض ادارے اسلامی مالیاتی طریقوں، یعنی مضاربت، مشارکت، مرابحہ اور اجارہ کے استعمال کا بھی تجربہ کررہے ہیں، تاہم ان تجربوں کی نوعیت محدود ہی کہی جاسکتی ہے، کیونکہ ان اداروں کا سائز خود بہت بڑا نہیں ہوتا، نہ ہی متاثر کن وسائل تک ان کی رسائی ہوسکتی ہے۔

ان میں سے بعض ادارے مثلاً مسلم فنڈ نجیب آباد وغیرہ کافی بڑے ہوگئے ہیں۔ ان اداروں کی کئی شاخیں ہیں اور مل جل کر یہ مزید فائدے حاصل کرسکتے ہیں۔

اس کی ضرورت ہے کہ ہندوستان میں فعّال ان اداروں کو مضبوط بنایا جائے اور ان کی کارکردگی میں بہتری لائی جائے۔ کچھ عرصہ قبل بعض اداروں کی جانب سے غیر سودی قرض انجمنوں کی ایک باہمی انجمن تشکیل دی گئی تھی، تاہم اس انجمن کے اعمال بوجوہ محدود ہی رہے اور کچھ عرصہ کے بعد وسائل کی کمی کے باعث انجمن کو اپنے دروازے بند کرنا پڑے، اس انجمن کی تجدید کی جاسکتی ہے تاہم چیزوں کو یہ احساس کرنا ہوگا کہ ان کی تائید وحمایت کے بغیر رضا کارانہ ادارے کسی طویل مدت تک نہیں چل سکتے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اداروں کو سوسائٹیز ایکٹ یا کوآپریٹیو سوسائٹیز کے تحت رجسٹرڈ کرایا جائے۔

فی الحقیقت ان انجمنوں کی نوعیت اور کارکردگی کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ ایک سماجی محقق نے ان اداروں کا سروے کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کچھ مفید معلومات فراہم نہ ہوسکیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان اداروں کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کی جائیں، تاکہ ان کا معاشی اور مالی تجزیہ ممکن ہوسکے۔ تب ہی ہندوستانی ملت اسلامیہ کی اجتماعی زندگی میں ان اداروں کے رول اور کردار کا تعین کیا جاسکے گا۔

اس بات کو ذہن میں رکھا جانا چاہیے کہ ہندوستان دنیا کے ان چند ممالک میں سے ہے جہاں تحریک امداد باہمی گہری جڑیں پکڑ چکی ہے، اور ابھی بھی اس تحریک کو فروغ دینے کے لئے حکومت کی جانب سے ہمت افزائی کے مختلف اقدامات کئے جاتے ہیں، اگر ہندوستانی مسلمان اپنی غیر سودی انجمنوں کی تنظیم نو، امداد باہمی کے خطوط پر کرسکیں تو اس سے مختلف فوائد حاصل ہوسکتے ہیں، کوآپریٹیو بنیادوں پر کریڈٹ سوسائٹیز، ہاؤسنگ سوسائٹیز، مارکیٹنگ سوسائٹیز یہاں تک کہ کوآپریٹیو بینک بھی قائم کئے جاسکتے ہیں (16)۔ تجارتی بینکوں کے مقابلہ میں کوآپریٹیو حکام کو شائد زیادہ آسانی سے قائل کیا جاسکے کہ بینک غیر سودی ہونے کے باوجود امداد باہمی کے اصولوں کی پابندی کرسکتے ہیں۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ غیر سودی کوآپریٹیو بینکوں کے قیام کا

واضح امکان ہے۔

ہندوستان میں اسلامی بینک کاری اور مالیات کے لئے ایک دوسرا مناسب میدان قلیل ترین قرضوں (Micro Financing) کا ہے۔ روایتی دست کاریوں کے علاوہ بعض جدید طرز کی صنعتیں بھی ہیں جو چھوٹے پیمانے پر کام کرتی ہیں، مثلاً برقی قوت سے چلنے والے کرگھے، ریفریجریشن ورکشاپ، ٹی وی مرمت وغیرہ، ان کاموں کے لئے قلیل ترین مقدار میں مالیات درکار ہوسکتی ہیں، چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں، دستکاریوں اور خود روزگار زمروں میں مسلمانوں کا تناسب کافی قابل لحاظ ہے، اگر صرف اتر پردیش کی ہی مثال لیں تو بہت سے ایسے کاروبار اور دستکاریاں ہیں جو اپنی ترقی وترویج کے لئے مسلم کاریگروں اور ماہرین فن کے مرہون منت ہیں۔ مثلاً چوڑیوں کی صنعت (فیروزآباد) ہتھ کرگھا (اعظم گڈھ) قالین بافی (مئو) زری ساڑیاں (بنارس) چکن (لکھنؤ) دباغت اور چمڑا سازی (کانپور) تالا (علی گڈھ) اور برتن (مرادآباد)۔ غیر سودی کریڈٹ سوسائٹیوں اور غیر سودی کوآپریٹیو بینکوں کے ذریعہ ان صنعتوں کو قرض فراہم کیا جاسکتا ہے، تاکہ جدید کاری اور ترقی کے ذریعہ ان صنعتوں کی کایاپلٹ کی جاسکے۔

گذشتہ دہوں میں ہندوستان میں بعض ایسی مالی کمپنیاں بھی وجود میں آئی ہیں جو غیر سودی بنیادوں پر کام کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں، یہ رجسٹرڈ کمپنیاں ہیں جن کو ریزرو بینک آف انڈیا غیر بینکی مالی کمپنیوں (Non-banking Financial Company) کے طور پر تسلیم کرتا ہے، یہ کمپنیاں عوام سے رقوم جمع کرتی ہیں، پھر ان کی سرمایہ کاری نفع میں شرکت کی بنیاد پر کرتی ہیں۔ تاہم عوام الناس کا پورا اعتماد حاصل کرنے کے لئے ابھی ان کو اپنے کام کاج میں مزید شفافیت لانے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی قانونی ضابطہ کے تحت کام کریں۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ ان میں سے بعض کمپنیوں کو ضروری قوانین اور قواعد کی عدم پیروی کے الزام میں بند کردیا گیا ہے۔ اس سے یہ احساس عام ہونا چاہئے کہ مکمل قوانین کی پابندی کس

قدر ضروری ہے، اسلامی مالیات کے ماہرین کو بھی اس جانب توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ ایسا قانونی نظام وضع کرنے کی جانب توجہ دیں جو ہندوستانی ماحول میں اسلامی مالیات کے فروغ کے لئے مدد و معاون ہو۔

اس ضمن میں ایک اور پہلو کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اسلامی بینک کاری اور مالیات کے فوائد صرف مسلمانوں تک محدود نہیں۔ ایک مخلوط معاشرہ میں اسلامی بینک کاری کے فیوض وبرکات سے غیر مسلموں کو محروم نہیں رکھا جاسکتا اور نہ ہی ایسا کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اگر سود ایک لعنت اور ایک برائی ہے تو ایسا پوری انسانیت کے لئے ہے، نہ کہ صرف مسلمانوں کے لئے، مختصراً یہ کہ اگر مناسب طریقہ سے اس کی پیروی کی جائے اور صحیح طریقہ سے اس پر عمل درآمد کیا جائے تو ہندوستان میں اسلامی بینک کاری اور مالیات کے لئے ایک درخشاں مستقبل ممکن ہے۔!

جدول-1

اتر پردیش کے ضلعوں میں مسلمانوں کی تعداد

کل آبادی کے تناسب کے طور پر		کل شہری آبادی کے تناسب کے طور پر	
مسلمانوں کا فیصد تناسب	ضلعوں کی تعداد	مسلمانوں کی فیصد تعداد	ضلعوں کی تعداد
زیادہ-24.01	8	زیادہ-40.01	7
13.01-24.01	12	25.01 - 40.0	12
3.01 - 13.0	29	11.0 - 25.0	29
کم-3.0	7	11.0سے کم	7

جدول- 2

ہندوستانی مسلمانوں کے ذریعہ بینکوں کا استعمال

فقط عوامی زمرے کے بینکوں کے لئے

	تمام اضلاع		اقلیتی ارتکاز والے اضلاع	
گروہ	حسابات کی کل تعداد	قرض دیا گیا (ملین روپے)	حسابات کی کل تعداد	قرض دیا گیا (ملین روپے)
مسلم	325, 4286 (9.34)	2138.18 (4.99)	105, 8320 (23.66)	107, 5707 (23.80)
مسلمانوں کے سوا دوسری اقلیتیں	225, 3381 (6.47)	2727.96 (6.36)	20, 5198 (4.58)	20, 6868 (4.57)
کل اقلیتیں	550, 7667 (15.82)	4866.09 (11.36)	126, 3518 (71.72)	128, 2575 (28.37)
دوسرے	293, 134, 53 (84.18)	37,968.78 (88.64)	320, 8129 (71.72)	323, 7171 (71.62)
کل جمع	348, 211, 20 (100.0)	42, 834.87 (100.0)	447, 1647 (100.0)	451, 9746 (100.0)

اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک

ایک علمی نظریہ کے طور پر اور بعض مسلم ممالک میں ابھرنے والے مالیاتی ادارہ کی شکل میں اسلامی بینک کاری نے گذشتہ کئی دہائیوں میں قابل لحاظ ترقی کی ہے۔ علم کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس ترقی کا اظہار ان بیسیوں کتابوں اور سیکڑوں تحقیقی مقالوں میں ہوا جو اس دوران منظر عام پر آئے ہیں۔ ایک ادارہ کی حیثیت سے بھی اسلامی بنک کاری نے خاصی ترقی کی ہے۔ کئی مسلم ممالک بالخصوص پاکستان، ایران، سوڈان، اور ملیشیا نے اپنے اپنے ملک میں اسلامی بینک کاری نظام شروع کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس کے لئے بعض اقدامات بھی کیے ہیں۔ ملیشیا نے دوہرے نظام بینک کاری کے ارتقاء کی خاطر کچھ اہم اقدامات کئے ہیں، اس مجوزہ نظام میں اسلامی نظام بینک کاری، اور دنیا میں مروجہ تجارتی بینک کاری نظام ایک دوسرے کے شانہ بشانہ عمل پذیر ہوں گے۔ مزید برآں، دنیا کے مختلف حصوں میں تین سے زائد طرح کے اسلامی مالیاتی ادارے کامیابی سے کام کررہے ہیں، جن میں اسلامی بینک، اسلامی انشورنس کمپنیاں، اسلامی سرمایہ کاری کمپنیاں وغیرہ شامل ہیں۔

تاہم بڑی حد تک یہ تمام ترقیاں، تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کے ممبر ممالک یعنی مسلم دنیا تک محدود ہیں۔ ایک حالیہ مطالعہ کے بموجب جہاں تک اسلامی مالیاتی اداروں کی تعداد کا تعلق ہے، 42 فی صدی اسلامی مالیاتی ادارے جنوب اور جنوب مشرقی ایشیاء کے مسلم ممالک میں مرتکز ہیں۔[1] لیکن اگر مالی وسائل کے استعمال پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے کل مالی وسائل کا 80 فیصدی استعمال خلیج عربی میں قائم شدہ اسلامی مالیاتی اداروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔[2]

اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ مسلمان صرف ان ملکوں میں نہیں رہتے جہاں ان کی اکثریت ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کی کل تعداد کا ایک معتد بہ حصہ مختلف مما لک میں اقلیتوں کی حیثیت سے قیام پذیر ہے، قیاس کیا جاتا ہے کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی کل تعداد ایک ارب سے کچھ اوپر ہی ہے جن میں تقریباً ایک تہائی (تقریباً 30 کروڑ) مختلف مما لک میں اقلیتی حیثیت میں رہتے ہیں۔ اس میں بھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اپنے اقلیتی کردار میں بھی، مسلمان کثیر تعداد میں ہیں، یہاں تک کہ ان کی تعداد بعض مسلم مما لک کی کل آبادی سے بھی بڑھ کر ہے۔ مثلاً ہندوستان میں ہی 15-12 کروڑ مسلمان آباد ہیں، بعض لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی کل تعداد بیس کروڑ کے آس پاس ہے۔ مسلمانوں کی معتد بہ تعداد چین میں بھی آباد ہے جس کا دنیا کی آبادی میں پہلا نمبر ہے۔ بد قسمتی سے چینی مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں صحیح اور قابل اعتبار اعداد وشمار دستیاب نہیں۔ سوویت یونین اور سابق یوگوسلاویہ کے انہدام کے بعد مرکزی ایشیاء اور مشرقی یوروپ میں کئی مسلم مما لک ظہور میں آگئے ہیں۔ گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں مسلم مما لک سے ہجرت کے نتیجہ میں مغربی یوروپ، اور امریکا میں بھی مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادیاں وجود میں آگئی ہیں۔ اس لئے بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کے باہر بھی مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادیاں موجود ہیں، اِن آبادیوں کا وجود اب دنیا کے تمام براعظموں ایشیاء، افریقہ، یوروپ، شمالی امریکا، کناڈا، آسٹریلیا، اور لاطینی امریکا میں ہے۔

مسلم اقلیتوں کی تعریف

یہ اعتراف ابتداء میں ہی کرلیا جانا چاہیے کہ اکثریت اور اقلیت، بنیادی طور پر عددی تصورات ہیں۔ لوگوں کے ایسے گروہ کو جن کے درمیان کچھ مشترک نسلی، مذہبی، لسانی یا تہذیبی

خصائص ہوں اور جو کسی بڑی آبادی کا جز ہوں، عام طور پر اقلیت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں اور مختلف زمانوں میں اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ عام طور پر اقلیتوں کو اکثریت کی بہ نسبت کم حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اقتدار میں بھی ان کا حصہ کم ہی ہوتا ہے۔ اقلیتوں کے وجود کا ایک اہم سبب کثیر الجہات آبادیوں کا وجود ہے جو عام طور پر ہجرت کے ذریعہ کسی ملک میں قیام پذیر ہوتی ہیں۔

تاہم اکثریت اور اقلیت صرف عددی تصورات نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ اہم سماجیاتی اور تہذیبی مضمرات وابستہ ہوتے ہیں، گو کہ لفظ اقلیت سے مراد، لوگوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو کچھ مشترکہ نسلی، مذہبی، تہذیبی یا لسانی خصائص رکھتا ہو، ایک بڑی آبادی سے منسلک ہو، اقلیت ہونے کے لئے کسی گروہ کے لئے مندرجہ ذیل شرطیں ضروری ہوئیں:

- یہ گروہ، اپنی مطلق شکل میں کسی بڑی آبادی کی نسبت کم تعداد میں ہو۔
- اس گروہ میں کچھ ایسے مشترکہ خصائص ہوں جن کی بنیاد پر اس گروہ کی امتیازی شناخت کی جاسکے۔

ان میں سے پہلی شرط کو، اقلیت کے وجود کی ضروری شرط (Necessary Condition) اور دوسری شرط کو کافی شرط (Sufficient Condition) خیال کیا جاسکتا ہے، اگر کسی گروہ کی تعریفی خاصیت نسل ہے تو وہ گروہ نسلی اقلیت قرار پائے گا اور اگر یہ لسانیات ہے تو وہ لسانی اقلیت (Linguistic Minority) قرار پائے گا۔ بدیہی طور پر مسلم اقلیات کے لئے تعریفی خاصیت (Defining Characteristic) اسلام کا اتباع ہے جو مسلم اقلیات کو ان کی علیحدہ شناخت عطا کرتا ہے۔ تاہم، اس مرحلہ پر ہم کو یہ بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے کہ مسلم اقلیات کے لئے ان کی مذہبی شناخت ہی واحد شناخت نہیں ہے۔ بہت سے مسلم اقلیتی گروہوں میں بعض دوسری تہذیبی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں جن کی بنیاد پر ان کی امتیازی شناخت کی جاسکتی ہے مثلاً سنکیانگ میں رہنے والے چینی مسلمان جن کی شناخت میں مذہب اور نسل دونوں

شامل ہیں۔ اسی طرح شمالی ہند کے مسلمان بالخصوص اردو بولنے والے مسلمانوں کو ایک مذہبی اقلیت بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور ایک لسانی اقلیت بھی۔

تاہم اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، خواہ وہ اکثریت سے تعلق رکھتے ہوں یا اقلیت سے، اپنی اجتماعی شناخت مذہب کی بنیاد پر کرتے ہیں، مسلمانوں کے لئے ان کی اسلامی شناخت ہی اصل شناخت ہے۔ ان کے تہذیبی وجود کے دوسرے پہلو، جن کی شناخت علاقہ، زبان، رنگ، نسل، یا ثقافت کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے، ان کی اصل شناخت کے تابع ہیں۔ یہ اسلام کا اتباع ہی ہے جس نے انھیں ایک رشتہ میں پرو رکھا ہے، اسی کے طفیل وہ نہ صرف مشترک عقیدے، اقدار، برتاؤ اور سماجی ومعاشی آدرشوں کے حامل ہیں بلکہ ایک مشترکہ تاریخ اور مشترک مستقبل بھی رکھتے ہیں۔

اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات کے موضوعات پر گذشتہ کئی دہائیوں میں جو لٹریچر وجود میں آیا ہے ایک مشترکہ اور زیریں مفروضہ پر قائم ہے، وہ مفروضہ یہ ہے کہ اس کے مطمح نظر ایسے ممالک ہیں جہاں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، چنانچہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ان کو ایسے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ ملک کی زر پالیسی (Monetary Policy) اور نظام بینک کاری کی صورت، کارکردگی، اور نظام عمل میں حسب خواہش تبدیلیاں کرسکتے ہیں اور ان کا نفاذ بھی کرسکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کو ان ممالک میں معاشی اقتدار اعلیٰ (Economic Sovereignty) حاصل ہے، لیکن مسلم ممالک سے باہر رہنے والے مسلمانوں کے لئے یہ نہیں کہا جاسکتا۔ دوسرے ممالک میں اقلیات کے طور پر رہنے والے مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی پسند کا نظام بینک کاری ملک میں نافذ کریں، یا ملک کے مروجہ نظام میں اپنی پسندیدہ تبدیلیاں کریں، خواہی نخواہی ان کو ایسے سماجی، سیاسی ومعاشی نظام میں رہنا ہوگا جو ملک کے اکثریتی باشندوں نے ملک کے لئے وضع کیا ہے۔ چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات کی ان ملکوں کے لئے کیا اہمیت ہے جو مسلم اکثریتی ممالک نہیں ہیں، اور

ان ملکوں کے مسلمان ان سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ زیرِ نظر مقالہ میں انھیں سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

تحقیقی مقاصد

اس مقالہ کے مقاصد درج ذیل ہیں:

- مسلم اقلیتی معاشروں کے لئے اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات کی معنویت کو دریافت کرنا۔
- اس نقطۂ نظر کا تنقیدی جائزہ لینا کہ غیر مسلم مما لک میں ربا (سود) جائز ہو سکتا ہے۔
- غیر مسلم مما لک میں اسلامی بینکوں کے اعمال کا جائزہ لینا۔
- مسلم اقلیتی معاشروں میں اسلامی مالیات کے کردار کا مطالعہ کرنا۔
- ایسے طریقے تجویز کرنا جن کے ذریعہ اسلامی بینک کاری اور اسلامی مالیات، مسلم اقلیات کی معاشی ترقی میں زیادہ مؤثر اور کارگر کردار ادا کر سکیں۔

گو کہ گذشتہ دو تین دہائیوں میں اسلامی بینک کاری کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے بارے میں خاصا علمی مواد جمع ہو گیا ہے، لیکن مشکل سے ہی کوئی ایسا تحقیقی مقالہ ہو گا جس میں مسلم اقلیات کے نقطۂ نظر سے ان مسائل کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہو۔ اسلامی بینک کاری پر لکھنے والوں نے مسلم اقلیات کے مسائل سے عموماً اغماض کیا ہے۔ اسلامی بینک کاری اور اسلامی معاشیات میں بین السطور ایک عام مفروضہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ اسلامی بنک کاری پر عمل درآمد ان ملکوں میں ہی کیا جائے جو عرفِ عام میں اسلامی مما لک یا مسلم مما لک کہلاتے ہیں، کیونکہ ان ملکوں میں مسلم عوام کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے اور وہ ملک کی مالیاتی اور بینک کاری پالیسیوں، ان کے کردار، اور رخ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، اگر ضروری مقدار میں سیاسی قوت ارادی موجود ہو تو ان ملکوں میں اسلامی اقتصادیات اور اسلامی مالیات پر عمل درآمد ممکن ہے، اور فی الحقیقت بعض مسلم

ملکوں نے اس رخ پر کچھ عملی اقدامات بھی کئے ہیں، اس طرح اسلامی نظام بینک کاری کے قائم کرنے کی سمت میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے، زیادہ تر اسلامی بینک مسلم مما لک میں ہی واقع ہیں، لیکن مسلم اقلیتی مما لک کے حوالہ سے اسلامی بینک کاری پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی۔

اگر اس ضمن میں کوئی استثناء ہے تو صرف یہ کہ جرنل انسٹی ٹیوٹ آف مسلم مائنارٹیز افیرز (Journal Institute of Muslim Minorities Affairs) نے جولائی 1992 میں اپنے شمارے کا ایک گوشہ مسلم اقلیتیں اور اسلامی بینک کاری کے عنوان سے مخصوص کیا، جس میں اس عنوان کے تحت چار مضامین شائع کئے گئے۔ محمد عمر چھاپرا نے اپنے مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ مسلم اقلیتی مما لک میں، مسلم اقلیتوں کی مالی ضروریات کی تکمیل کے لئے، اسلامی بینک کاری میں جزئی قرض (Micro Credit) کا تصور شامل کیا جاسکتا ہے، تاکہ چھوٹے پیمانے کے تاجروں، دست کاروں، خردہ فروشوں اور کاشتکاروں کو سرمایہ کاری فراہم کی جاسکے [3]۔ ملامی نے نائیجیریا کی مثال سامنے رکھتے ہوئے ایک مسلم اقلیتی ملک میں اسلامی بینکوں کے قیام کے امکانات کا جائزہ لیا ہے، حالانکہ بعض لوگوں کو اسی پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ نائیجیریا کو مسلم اقلیتی ملک کیوں کر قرار دیا گیا [4]۔ رحمت اللہ نے اپنے مضمون میں ہندوستان میں اسلامی بینکوں کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے [5]۔ اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے اوصاف احمد نے یہ نکتہ اٹھایا کہ ہندوستان میں کام کرنے والے ان اداروں کو جن کا جائزہ رحمت اللہ نے پیش کیا ہے، اسلامی بینک قرار دینا درست نہ ہوگا، کیونکہ زیادہ تر ادارے غیر منظم زمرے (Unorganized Sector) میں عمل پذیر ہیں اور اپنی پشت پر کسی طرح کی قانونی ضمانت نہیں رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ ان اداروں کو غیر سودی قرض دینے والی انجمنیں قرار دیا جاسکتا ہے [6]۔ ایک اسلامی بینک کار کی حیثیت سے شیخ صالح عبداللہ کامل نے غیر مسلم مما لک میں مسلم اقلیات کی ترقی کے لئے اسلامی بینکوں کے پیش نظر مسائل کا جائزہ لیا ہے [7]۔

حرمت ربا اور مسلم اقلیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی مسلم اقلیات حرمت ربا کا بہت احترام کرتی ہیں، چنانچہ بہت سے مسلمانوں کے ذہن میں، حرمت ربا کے پیش نظر، تجارتی بینکوں سے معاملات کے سلسلہ میں سنگین تحفظات پائے جاتے ہیں، ان میں سے بھی جو تجارتی بینکوں سے معاملہ رکھتے ہیں، انتہائی مجبوری میں اور شدید ضرورت کے باعث ایسا کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں بھی بیشتر حالتوں میں، یا تو وہ جاری حساب کھولنے کو ترجیح دیتے ہیں، یا پھر بینک سے ملنے والا سود لیتے ہی نہیں، پھر بھی بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ غیر مسلم علاقوں میں رہنے والوں پر حرمت ربا کا اطلاق نہیں ہوتا، اس لئے سودی نظام بینک کاری سے معاملت کی جاسکتی ہے، یہ دلیل ایک فقہی رائے پر منحصر ہے جس کے مطابق ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سودی معاملہ جائز ٹھہرایا جاتا ہے، بشرطیکہ معاملہ دار الحرب میں کیا جارہا ہو۔[8]

گو کہ اس نقطہ نظر کو قبول عام حاصل نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کی اچھی طرح چھان پھٹک ضروری ہے۔

یہ تو عام طور پر معروف ہے کہ شرعی قوانین کی بنیاد وحی الہی ہے جو قرآن پاک اور سنت رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے، قرآن اور سنت زمان ومکان کے اعتبار سے نا قابل تغیر وتبدل ہیں، قرآنی احکامات اپنی نوعیت کے لحاظ سے عام، غیر تاریخی اور نا قابل تغیر ہیں، لیکن علم کا وہ حصہ جو فقہی علوم یا فقہ کے طور پر جانا جاتا ہے، وحی الٰہی کے انسانی فہم وادراک کا نتیجہ ہے۔[9] چونکہ شرعی قوانین قرآن اور سنت کی عمومیت کا نتیجہ ہیں اس لئے مکانی تبدیلی کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ مسلم اور غیر مسلم دونوں علاقوں میں یکساں طور پر نافذ رہیں گے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلامی قوانین تعزیری بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔ اگر غیر مسلم علاقوں میں اسلامی قوانین کا تعزیری پہلو نہ بھی نافذ ہو تو بھی اس کا اخلاقی پہلو قابل نفاذ رہے گا۔ چنانچہ غیر مسلم

علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کو صرف اس لئے اسلامی قوانین سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ ایسے علاقوں میں قیام پذیر ہیں جو اسلام کے تعزیری قوانین کے حیطۂ عمل سے باہر ہے، غیر مسلم علاقوں میں، ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں خود مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی اور سماجی زندگی میں اسلامی طرز زندگی کا اتباع کریں اور اس طرح وہ اپنے اعمال کے لئے براہ راست اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے، اس لئے یہ بات قدرے تعجب انگیز ہے کہ کوئی اس بات کی وکالت کرے کہ غیر مسلم علاقوں میں رہنے والے مسلمان، غیر مسلموں سے سودی معاملہ کر سکتے ہیں۔

مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربا پر فقہی آراء

مسلم اور غیر مسلم کے درمیان رباء کے مسئلہ پر مسلم فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے، اس میں سے ایک گروہ، جس میں امام ابوحنیفہؒ، امام ابن تیمیہؒ اور امام محمدؒ جیسے عظیم فقہاء شامل ہیں، یہ رائے رکھتا ہے کہ غیر مسلم ممالک میں ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربوی معاملہ جائز ہے، دوسرا گروہ، جس میں امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور حنبلی وشافعی علماء کی کثیر تعداد شامل ہے، اس بات کا کوئی امکان نہیں دیکھتا، اس کا کہنا ہے کہ ربا جسے قرآن وسنت نے صریحاً حرام قرار دیا ہے، کسی بھی حالت میں جائز کیسے ہوسکتا ہے۔ فریقین نے اپنے موقف کی حمایت میں وزنی دلائل دیئے ہیں، ذیل میں ان دلائل کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

جواز کے حق میں دلائل

روایت ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے فرمایا:

> ''ربا مسلم اور غیر مسلم دونوں علاقوں میں حرام ہے، سوائے اس کے کہ معاملہ ایک مسلم اور ایک غیر مسلم کے درمیان ہو اور ان کے درمیان معاہدۂ امن موجود نہ

ہو''(10)۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر معاہدہ امن موجود نہ ہو تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سودی معاملہ، مسلم اور غیر مسلم دونوں علاقوں میں جائز قرار پائے گا۔ یہ نقطۂ نظر مندرجہ ذیل دلائل پر مبنی ہے:

مشہور فقیہ امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب مبسوط میں لکھا ہے:

''مکحول سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں اور دارالحرب کے لوگوں کے درمیان کوئی ربا نہیں ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے، مکحول ایک قابل اعتبار فقیہ تھے۔ ان کی بیان کردہ روایت قابل قبول ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد نے اپنے دلائل کی بنیاد اس حدیث پر رکھی ہے''۔(11)

کہا جاتا ہے کہ زمانہ جنگ میں غیر مسلم کا مال معصوم نہیں ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے ایسے مال پر قبضہ کرنا جائز ہے، فقہی اصطلاح میں ایسا مال مباح ہے (یعنی حرام یا ممنوع نہیں ہے)۔ کاسانی نے بدائع الصنائع میں کہا ہے:

''مال الحربی مباح؛ لأنه لا عصمة لمال الحربی''

(حربی کا مال مباح ہے کیونکہ اس کا مال (زمانۂ جنگ میں) معصوم نہیں ہے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ (زمانۂ جنگ میں) اس کی اجازت ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربا اور دوسرے ممنوع عقود قرار پاسکیں۔ ربا اور ممنوعہ عقود کی حرمت صرف ان معاملات کے درمیان ہوگی جن میں فریقین مسلم ہوں، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے ممنوع عقود، مثلاً ربا اور قمار کی اجازت ان معاملات میں دی جاسکتی ہے، جن میں ایک فریق غیر مسلم علاقہ کا رہنے والا ہو (حربی) اور دوسرا مسلم ہو، جو چند خاص شرائط کے تحت غیر مسلم علاقہ میں داخل ہوا ہو۔ اس موقف کی تائید میں دو تاریخی آثار پیش کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب اسلام لانے کے بعد بھی مکہ میں مقیم تھے

اور مکہ کے رہنے والے (غیر مسلموں) کو سود پر قرض دیا کرتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ نے حج وداع کے موقع پر سود کے خاتمہ کا اعلان کیا تو عباسؓ بن عبدالمطلب کے سود کا تذکرہ نام لے کر کیا۔ دوسرا واقعہ قمار سے متعلق ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قدیمی رفیق اور یار غار حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کفار مکہ میں سے کسی کے ساتھ ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ کے نتیجہ پر شرط لگائی اور یہ شرط سو اونٹوں کی تھی، اس وقت تک قمار ممنوع نہیں قرار دیا گیا تھا، لیکن قمار منع ہو جانے کے بعد بھی حضرت ابوبکرؓ کو اونٹ لینے دیا گیا کہ وہ شرط جیت گئے تھے۔

یہاں بین السطور میں یہ مفروضہ موجود ہے کہ جو غیر مسلم ذمی نہیں ہیں (یعنی اسلامی ریاست نے ان کے جان و مال کی ذمہ داری قبول نہیں کی) ان کا مال مباح ہے۔ اسی طرح بادی النظر میں یہ مفروضہ بھی موجود ہے کہ غیر مسلم علاقوں کو جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہیں دارالحرب قرار دیا جائے۔

اس طرح یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ غیر مسلم علاقوں (دارالحرب) میں رہنے والے اقلیتی فرقہ کے مسلمان تجارتی بینکوں (غیر مسلم) سے ربا (سود) وصول کر سکتے ہیں [12]۔ کہا جاتا ہے کہ مغلوں کی حکومت کے خاتمہ اور انگریزوں کا اقتدار قائم ہونے کے بعد ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دے دیا گیا تھا۔ اس نقطۂ نظر کی سب سے پرزور وکالت جناب مناظر احسن گیلانی نے کی تھی جو اپنے وقت کے ایک اہم عالم تھے اور جامعہ عثمانیہ میں ناظم دینیات بھی تھے۔ [13] گیلانی صاحب کی دلیل یہ تھی کہ برطانوی ہند اب دارالکفر ہے، اس لئے غیر مسلموں کے مال ومتاع پر ان عقود کے ذریعہ بھی قبضہ مالکانہ حاصل کیا جا سکتا ہے، جن کو عام طور پر اسلام میں جائز متصور نہیں کیا جاتا۔ ایک طرح سے یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ عقود جو اسلامی ریاست میں جائز نہیں ہیں، غیر اسلامی ریاست میں جائز ہو جاتے ہیں، ربا ایک ایسا عقد ہے جس کے ذریعہ (قرض کی ادائیگی کے وقت) قرض لینے والے (borrower) کا کچھ مال (سود کی شکل میں) قرض دینے

والے (Lender) کو منتقل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں اس کی ممانعت ہے، لیکن ملحوظ رہے کہ یہ اسلام کا قانون ہے اور اس کا نفاذ اسلامی ریاست میں ہی ممکن ہے، غیر اسلامی ریاست اسلامی قوانین پر تو چلتی نہیں۔ یہ اس دلیل کا خلاصہ ہے۔

عدم جواز کے حق میں دلائل

اوپر بیان کیے گئے موقف کے برعکس دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ربا کا لینا اور دینا، دونوں قطعی طور پر حرام ہیں اور اس کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں علاقوں میں یکساں طور پر ہوگا۔ یہ نقطۂ نظر امت مسلمہ میں عام طور پر رائج ہے۔ شافعی، حنبلی، مالکی اور دوسرے مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے بہت سے فقہاء اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ ایک معاصر اسلامی مفکر نزیہہ حماد اس ضمن میں امام نووی کی ایک رائے کا حوالہ دیتے ہیں:

> ''علماء اس بات پر متفق ہیں کہ حرمت ربا کا اطلاق مردوں اور عورتوں، آقا اور غلام سب پر یکساں طور پر ہوتا ہے، حرمت ربا کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم علاقوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ جو کچھ مسلم علاقوں میں حرام ہے، وہ غیر مسلم علاقوں میں بھی حرام رہے گا، اس سے قطع نظر کہ معاملہ صرف مسلمانوں کے درمیان ہے یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہے، یا یہ کہ ان کے درمیان معاہدۂ امن ہے کہ نہیں۔ اس معاملہ میں یہ ہماری رائے ہے، اور مالکؒ، احمدؒ، ابو یوسفؒ اور دوسرے بہت سے فقہاء کا موقف بھی یہی ہے[14]۔

آیئے اب ان دلائل کا جائزہ لیں جو غیر مسلم علاقوں میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربوی معاملہ کے عدم جواز کے بارے میں دیئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور امام ابن تیمیہؒ اور دوسرے تمام فقہاء، جو دارالحرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربوی معاملے کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، ان سب نے اپنے استدلال کی بنیاد اس حدیث پر رکھی

ہے جس کی روایت مکحول نے کی ہے۔ خیال رہے کہ مکحول کے سوا کسی اور محدث نے اس حدیث کو بیان نہیں کیا۔ محدثین کی اصطلاح میں مکحول کی روایت کردہ اس حدیث کو ''غریب'' قرار دیا گیا ہے، احادیث کے ردوقبول کے معاملہ میں تواتر کو ایک اہم نکتہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک حدیث صرف ایک راوی نے بیان کی ہے تو اس حدیث کا درجہ بہت اونچا نہیں سمجھا جاتا۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل نکات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

1- یہ استدلال کہ غیر مسلم کا مال مباح ہے اور اسے شریعت کا تحفظ حاصل نہیں، عام نہیں ہے۔ ایسا صرف حالتِ جنگ میں ہی ہوسکتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ برسرِ جنگ غیر مسلم میں، اور ایسے غیر مسلم میں امتیاز کیا جائے جو برسرِ جنگ نہیں ہے۔ حالتِ جنگ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاملات، جوابی تعامل (Reciprocity) کی بنیاد پر طے ہوں گے۔ زمانہ قدیم میں جب دو ملک ایک دوسرے سے برسر جنگ ہوتے تو وہ ایک دوسرے کے مال ومتاع اور لوگوں پر قبضہ کرلیا کرتے تھے۔ ''مال الحربی مباح لأنه لا عصمة لمال الحربی'' کی تعبیر وتحلیل اسی پس منظر میں کی جانی چاہیے۔ حالت امن میں ان تمام غیر مسلموں کو جو برسرِ جنگ نہیں ہیں اتنا ہی تحفظ اور امن فراہم کیا جائے گا، جتنا کہ مسلمانوں کو، اس لئے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربوی معاملہ کے جواز کے بارے میں جو دلائل دیئے گئے ہیں ان کا تعلق حالت جنگ سے ہے نہ کہ حالت امن سے، یہ اصول سے ایک استثناء ہے نہ کہ خود اصول۔

2- یہ دلیل درست نہیں ہے کہ ممنوع عقود جیسے میسر، قمار، اور ربا، دارالحرب میں جائز ہو جاتے ہیں، گوکہ یہ درست ہے کہ وہ قوانین جن کے تحت یہ اعمال ممنوع قرار دیے گئے ہیں، اسلامی ریاست کے قوانین ہیں، اسلامی ریاست کو دیگر تمام ریاستوں کی طرح اپنے قوانین اپنے سیاسی اور انتظامی حدود کے باہر نافذ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ تاہم اس بات کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ اسلامی قوانین کا ایک قانونی اور تعزیری پہلو ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا ایک اخلاقی

اور معاشرتی پہلو بھی ہے۔ ان قوانین کا تعزیری پہلو اسلامی حکومتوں کی حدود کے باہر بھلے ہی قابل تنفیذ نہ ہو، لیکن اس کے اخلاقی پہلو کے نفاذ کے لئے کسی تعزیری یا قانونی اختیار کی ضرورت نہیں۔ اسلامی قوانین کے اخلاقی پہلو کے نفاذ کی ذمہ داری ہر مسلمان کی ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اسلام کے ضابطۂ اخلاق کی پابندی کرے اور وہ اس امر کے لئے اللہ عزوجل کے سامنے جوابدہ ہے، اگر وہ اس ضابطہ اخلاق کی پابندی نہیں کرتا تو اللہ کی نظر میں گنہگار ہوگا، اسلام کے ضابطہ اخلاق کی پابندی زمان و مکان سے قطع نظر ہر مسلمان کے لئے لازمی ہے۔

3- غیر مسلم علاقوں (دارالحرب) میں ربوی معاملوں کے حق میں جو دو تاریخی آثار پیش کئے جاتے ہیں ان پر بھی تحقیقی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ پہلے ہم حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب والا واقعہ لیتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے واقعہ سے اس موقف کو تقویت پہنچتی ہے کہ غیر مسلم علاقوں میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ربوی معاملہ کی گنجائش نکلتی ہے، کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی فتح مکہ سے قبل حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب مکہ میں مقیم تھے اور ربوی معاملہ کیا کرتے تھے، جس کو بعد میں رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے دوران اپنے خطبہ میں باطل قرار دیا، اس بیان میں یہ وضاحت سامنے نہیں آئی کہ جب حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب مکہ میں مقیم تھے اور سودی کاروبار میں ملوث تھے اس وقت تک ربا کو قطعی طور پر حرام نہیں قرار دیا گیا تھا۔ بیشتر اسلامی مؤرخین اور مفسرین قرآن اس بات پر متفق ہیں کہ ربا کو حرام قرار دینے والی آیات بالخصوص سورۂ بقرہ کی آیت 279 قرآن کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات تھیں، گو کہ اس سے قبل بعض ایسی آیات نازل ہو چکی تھیں جن میں ربا کی مذمت کی گئی تھی، لیکن اس کو قطعی طور پر حرام نہیں قرار دیا گیا تھا جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت 279 میں کیا گیا۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ جب حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا سودی کاروبار مکہ میں جاری تھا اس وقت تک ربا مکمل اور قطعی طور پر حرام نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ

ربا یک لخت چھوڑ دیں، یہ حکم سورۂ بقرہ کی آیت 279 میں ہی نازل ہوا۔ اس لئے حضرت عباس بن عبدالمطلب کے واقعہ سے دارالحرب میں سود کا جواز ڈھونڈنا صحیح نہیں! اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق کا شرط لگانے والا واقعہ صحیح ہے، لیکن پوری روایت میں یہ اضافہ بھی موجود ہے کہ شرط جیتنے کے بعد وصول کیے گئے اونٹ صدقہ کر دیئے گئے تھے۔ اسی لئے ان دو واقعات سے دارالحرب میں عقود فاسدہ کے جواز کے لئے کافی بنیاد فراہم نہیں ہوتی۔ بیشتر علماء کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی بھی حالت میں عقود فاسدہ کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے، خواہ یہ معاملہ مسلمانوں سے ہو یا غیر مسلموں سے، خواہ یہ معاملہ مسلم علاقہ میں ہو یا غیر مسلم علاقہ میں، ان کی ممانعت زمان و مکان سے ماوراء ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے مطلق! امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور دیگر کئی ائمہ نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔

علاقوں کی فقہی درجہ بندی

مندرجہ بالا تجزیہ مسلم اور غیر مسلم علاقوں کے حوالہ سے کیا گیا ہے، فقہ اسلامی کے قدیم مآخذ میں علاقوں کی درجہ بندی اس طرح کی گئی ہے:

۱- اسلامی علاقے یا دارالاسلام

۲- وہ علاقے جو دارالاسلام کی عملداری سے باہر ہوں۔

دوسرے درجہ کو قدیم فقہی کتابوں میں کئی ناموں سے پکارا گیا۔ ان میں سے سب سے معروف نام دارالحرب ہے جس کا ایک عام ترجمہ غیر مسلم علاقہ بھی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ترجمہ پوری طرح صحیح نہیں۔ شاید دشمن علاقہ ''دارالحرب'' کا ایک بہتر ترجمہ ہو، بعض مصنفین علاقوں کی تقسیم دارالاسلام (اسلامی علاقہ) اور دارالکفر (غیر اسلامی علاقہ) میں کرتے ہیں، دارالکفر کو دوبارہ دو درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: دارالحرب اور دارالامان۔ دارالحرب وہ غیر مسلم علاقہ ہے جو اسلامی علاقے سے برسرپیکار ہے، اس کے برعکس دارالامان وہ غیر اسلامی علاقہ ہے جو

اسلامی علاقہ سے معاہدۂ امن رکھتا ہو۔ظاہر ہے ہر غیر مسلم ملک کو دار الحرب نہیں قرار دیا جاسکتا ہے،اس کی ایک اچھی مثال رسول کریم ﷺ کی حیات مبارک کے دوران جبش کی ہے، جہاں رسول کریم ﷺ کی اجازت اور منظوری سے اصحاب رسولؐ نے پناہ حاصل کی تھی، گو کہ اس وقت بھی جبش ایک غیر مسلم ملک تھا لیکن وہاں مسلمانوں کو پناہ دی گئی تا کہ وہ امن سے رہ سکیں اور آزادی سے اپنے دین کی اتباع کر سکیں۔موجودہ زمانہ کی اصطلاح کے مطابق اس وقت جبش میں مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی،اسی لئے بعض فقہاء نے جبش کو دار الامان قرار دیا ہے۔

درجہ بندی کی بنیاد

علاقوں کو دارالاسلام کس بنیاد پر قرار دیا جاتا ہے، مختلف فقہی کتابوں کے تجزیہ کے بعد مندرجہ ذیل عوامل کی نشان دہی کی جاسکتی ہے:

- اسلامی قوانین کا اعلان
- مسلم آبادی
- مسلم حکمرانوں کا اقتدار اعلیٰ

مسلم علاقوں کو غیر مسلم علاقوں سے ممتاز وممیّز کرنے کے لئے فقہاء نے ان تمام خصوصیات کا استعمال کیا ہے، لیکن ان میں سے نمایاں ترین اور سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ آیا اس علاقہ میں اسلامی قوانین کا اطلاق کیا جاتا ہے اور کیا اس علاقے کے رہنے والے اسلامی طرز زندگی اپنا چکے ہیں؟ اگر ان سوالات کے جوابات اثبات میں ہیں تو اس کو دار الاسلام قرار دیا جاتا ہے۔مسلمانوں کی آبادی اور مسلم اقتدار کو بھی اہم عوامل قرار دیا جاتا ہے، گو کہ یہ ممکن ہے کہ بعض اوقات انھیں اہم اور فیصلہ کن عامل نہ قرار دیا جائے، مثلاً مسلم دور حکومت کے دوران ہندوستان کو دار الاسلام سمجھا جاتا رہا گو کہ اس وقت بھی، جیسا کہ اس وقت ہے، اپنی عددی قوت کے اعتبار سے ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس لئے ہندوستان کو دار الاسلام قرار

دینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہاں مسلمان اقتدار اعلیٰ کے مالک تھے، اس کے باوجود کہ یہاں شرعی قوانین کبھی بھی اپنی مکمل صورت میں نافذ نہیں رہے۔ جب اس اقتدار کا خاتمہ ہوگیا، اور انگریز اقتدار اعلیٰ کے مالک بن گئے تو برطانوی ہند کو دارالحرب قرار دینے میں کوئی تامل نہیں کیا گیا۔

ایک دار کا دوسرے میں تبدیل ہونا

کلاسیکی فقہاء نے اس امکان کا اعتراف کیا ہے، بعض تبدیلیوں کے سبب یہ ممکن ہے کہ کوئی علاقہ دارالاسلام کا درجہ گنوا بیٹھے، اگر کوئی ملک دارالاسلام متصور کیا جاتا ہے، لیکن جن بنیادوں پر اس علاقہ کو دارالاسلام قرار دیا گیا تھا ان میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس فیصلے میں بھی تبدیلی ہوسکتی ہے، اس طرح یہ ممکن ہے کہ دارالاسلام، دارالکفر یا دارالحرب میں تبدیل ہوجائے۔

اس سلسلہ میں کاسانی لکھتے ہیں:

"إن دار الإسلام لا تعتبر دار الكفر إلا بثلاث شرائط: أحدها ظهور أحكام الكفر فيها، الثانی أن لا تكون ملحقة بدار الإسلام، والثالث ألا يبقى فيها مسلم أو ذمی آمنا بالأمان الأول" [کاسانی: بدائع الصنائع ج ۱۳]

(ایک مسلم علاقہ (دارالاسلام) غیر مسلم علاقہ (دارالکفر) میں تبدیل نہیں ہوسکتا، سوائے ان تین شرائط کے: اول، اس علاقے میں غیر اسلامی قوانین رائج ہوجائیں۔ دوم، وہ علاقہ دارالکفر سے ملحق ہو۔ سوم، یہ کہ اس میں کوئی ایسا مسلمان یا ذمی باقی نہ بچے جس کو اس کی ابتدائی امان حاصل ہو)۔

ابتدائی امان سے مراد وہ استحقاقات ہیں جو مسلمانوں کو اسلام کی رو سے اور ذمیوں کو عقد الذمہ کی رو سے حاصل ہیں، مثلاً اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے جان و مال محفوظ ہیں، یہ حق ان کو شریعت کی طرف سے حاصل ہے، فقہی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے جان و مال

معصوم (یا محفوظ ہیں) اور کسی فرد یا ریاست کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس حق کو سلب کرے، ذمیوں کو یہ حقوق ریاست سے ایک معاہدہ کے تحت حاصل ہوتے ہیں، جس کی رو سے وہ (ذمی) اسلامی ریاست کو جزیہ ادا کرتے ہیں اور اسلامی ریاست ان کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہے، یہ عہد عقد الذمہ کہلاتا ہے، بعض صورتوں میں اہل الذمہ کو لازمی فوجی خدمت سے بھی مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے، ان حقوق کے عوض ہی ذمی ریاست کو جزیہ ادا کرتے ہیں، کیونکہ ریاست ان کے حقوق کی محافظ ہے۔

جدید دنیا میں داروں کی درجہ بندی اور اس کی معنویت

دنیا کی دو حصوں، دار الاسلام اور دار الحرب میں کی گئی تقسیم، جو عہد قدیم کے فقہاء میں قدرے مقبول تھی، عہد جدید میں کچھ زیادہ مفید نہیں معلوم ہوتی۔ ذیل میں ان نکتوں کی وضاحت کی جاتی ہے جن کی بنا پر ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوئے ہیں:

1- قدیم فقہاء دار الاسلام کو ایک مکمل سیاسی وحدت تصور کرتے تھے۔ یہ سیاسی وحدت اپنی جغرافیائی حدود سے جانی جاتی تھی۔ اب عالم اسلام کسی ایک سیاسی وحدت کے بجائے پچاس سے زائد آزاد اور مقتدر ریاستوں (Independent and Sovereign States) پر مشتمل ہے، اس لئے اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد پر ان میں سے ہر ملک اپنے طور پر دار الاسلام متصور کیا جا سکتا ہے، لیکن بعض دوسری بنیادوں پر مثلاً اسلامی قوانین کے اطلاق کی بنیاد پر ان میں سے کوئی ملک دار الاسلام قرار دیئے جانے کا مستحق نہیں۔

2- مسلم ممالک میں سے بیشتر ایک دوسرے سے جغرافیائی طور پر ملحق نہیں ہیں۔

3- دار الاسلام کے اندر مسلمانوں کو آزادانہ نقل و حرکت کا حق حاصل ہوتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ملحقہ غیر مسلم علاقوں سے مسلمانوں کو دار الاسلام میں ہجرت کا حق ہونا چاہیے، لیکن موجودہ زمانہ میں بیشتر ملکوں نے آزادانہ نقل و حرکت پر مختلف طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور غیر ممالک کے مسلمان، ان ملکوں میں آزادانہ طور پر داخل نہیں ہو سکتے۔

4- زیادہ تر مسلم ممالک میں اسلامی قوانین رائج نہیں ہیں۔

اس کے ساتھ ہی فی زمانہ ہر غیر مسلم ملک کو دارالحرب بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، اس ضمن میں مندرجہ ذیل نکات پر غور کرنا ضروری ہے۔

1- فی زمانہ بیشتر غیر مسلم ممالک، عالم اسلام سے برسر جنگ نہیں ہیں۔

2- موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک سے غیر مسلم ممالک کی طرف نقل آبادی ہوتی ہے۔ یعنی نقل آبادی کا رخ تبدیل ہوگیا ہے۔ زمانہ قدیم میں نقل آبادی کا سلسلہ غیر مسلم ممالک سے مسلم ممالک کی طرف تھا۔

3- (مغرب کے) ان ممالک میں مسلمانوں کو ایسے قوانین کے تحت جان و مال کا تحفظ حاصل ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مشترک ہیں۔

4- مسلمانوں کو ان ممالک میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ ان میں سے بیشتر ممالک نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی اعلامیہ (Universal Declaration of Human Rights) کی توثیق کی ہے جو انسانوں کے ذاتی، شہری، سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی حقوق کی پاسداری کرتا ہے۔ ان حقوق کی حد بندی صرف اس بات سے ہوتی ہے کہ دوسرے افراد کے حقوق کا بھی احترام کیا جائے اور عام طور پر معاشرتی اخلاق، عوامی نظم و انتظام اور معاشرے کی بہبود کا خیال رکھا جائے۔ اس طرح موجودہ زمانے میں عام طور پر اقلیتوں کو جن میں مسلم اقلیت بھی شامل ہے، اپنے متعلقہ ممالک میں زندگی، آزادی، تحفظ، شخصی آزادی، گرفتاری سے آزادی، منصفانہ عدالتی کارروائی، تخلیہ (Privacy)، نقل و حرکت کی آزادی، رہائش کی آزادی، آزادئ فکر، آزادئ اظہار، آزادئ ضمیر اور آزادئ مذہب وغیرہ کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

ان اسباب کی بنا پر موجودہ زمانہ کے غیر مسلم ممالک کو دارالحرب قرار دینا درست نہیں ہوگا۔ اس لئے دارالحرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربوی معاملات پر دی گئی فقہی آراء ان مسلمانوں پر منطبق نہیں ہوتیں جو موجودہ زمانہ میں کسی غیر مسلم ملک میں اقلیت کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ان فقہی آراء کا استخراج اس زمانہ میں کیا گیا تھا جب مسلمانوں کو ان ممالک کا سفر درپیش ہوتا تھا جو مسلم ملک سے برسر جنگ ہوں۔ کسی ہنگامی صورت حال میں ان کی تجارت اور مال کو مختلف قسم کی خطر انگیزیوں کا سامنا کرنا پڑسکتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ان خطر انگیزیوں (Risks) کا تقریباً خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں مسلمان اب ان ملکوں میں مستقل باشندوں کی طرح قیام پذیر ہیں نہ کہ عارضی مسافروں کی طرح۔ وہ ان ممالک میں یا تو اپنی مرضی سے قانونی طریقہ پر مقیم ہیں یا پھر وہ ان ہی ممالک میں پیدا ہوئے ہیں اور دوسرے شہریوں کی طرح رہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اُن پر ان فقہی آراء کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا جن کا استخراج اب سے کئی سو سال پہلے کسی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔

موجودہ زمانہ کے غیر مسلم ممالک کو جہاں مسلمان اقلیتوں کی حیثیت سے قیام پذیر ہیں دارالامان قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ان کے اصحابؓ کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے نجات پانے کے لئے بادشاہِ حبش کی پناہ میں گئے تھے۔ موجودہ زمانہ میں بھی مسلمان غیر مسلم ممالک (بالخصوص مغربی ممالک میں) ان ملکوں کی حکومتوں کی باضابطہ اجازت سے قیام کے لئے گئے ہیں۔ وہ ان ملکوں میں رائج قوانین کے تحت وہاں قیام پذیر ہیں، جہاں ان مسلمانوں کا ایک طرف یہ فرض ہے کہ وہ ان غیر مسلم ممالک میں پرامن اور پابند قانون (Law Abiding) شہریوں کی طرح رہیں، وہاں ان پر یہ بھی لازم ہے کہ اسلام کے اخلاقی قوانین کی پابندی کر کے وہ اپنی شناخت کو قائم رکھیں۔ اس کو ایک مثال سے بھی واضح کیا جاسکتا ہے۔ قانون کی رو سے

تقریباً تمام مغربی ملکوں میں اور بہت سے مشرقی ملکوں میں بھی خمر (شراب یا الکحل) کے استعمال کی اجازت ہے، تاہم کوئی ایسا قانون نہیں جو کسی مسلم یا غیر مسلم فرد کو الکحل کے جبراً استعمال پر مجبور کرے۔ مغربی جمہوریتوں میں یہ فرد کے ذاتی انتخاب کا معاملہ ہے، اگر کوئی شخص ذاتی، اخلاقی یا مذہبی بنیادوں پر الکحل سے دور رہنا چاہتا ہے تو ریاست یا کوئی دوسرا فرد اس کی مرضی کے خلاف اسے اِس کے استعمال پر مجبور نہیں کرسکتا۔ ایسا ہی ربا کا معاملہ بھی ہے، گو کہ وہ اس مثال سے ذرا زیادہ پیچیدہ ہے، کیونکہ موجودہ مغربی جمہوریتوں میں ربا سے محفوظ رہنے کے لئے صرف انفرادی اقدام یا فیصلہ کافی نہیں۔ اس کے لئے کسی نہ کسی حد میں اجتماعی اقدام بھی ضروری ہے، تاہم اگر جرأت آزما اور خیال انگیز اقدامات کئے جائیں تو ربا سے گریز بھی ممکن ہے۔ اس مقالہ کے باقی ماندہ حصے میں ہم ایسے ہی اقدامات اور تجاویز کا جائزہ لیں گے۔

مسلم اقلیتی ممالک میں اسلامی بینک کاری: قضایا اور مسائل

ہم اس بات کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں اقلیتوں کی حیثیت سے قیام پذیر ہے۔ یہ ایک زمینی حقیقت ہے کہ اس جدید عہد میں بھی بیشتر ممالک میں اقلیتوں کو اپنی مرضی کی زندگی گذارنے کے لئے وافر سیاسی قوت میسر نہیں، تاہم ان کو بعض سیاسی اور سماجی حقوق ضرور حاصل ہوتے ہیں، جن کا سرسری تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے۔ غیر مسلم ممالک میں اقلیتوں کی حیثیت سے رہنے والے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک علیحدہ مذہبی اور ثقافتی گروہ کی شکل میں وہ اپنی سماجی اور ثقافتی شناخت کو کس طرح قائم رکھیں اور اس کا تحفظ کیسے کریں، یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اور اس کا تعلق سماجی اور معاشی عوامل سے ہے۔ مسائل کی شدت اور نوعیت میں بھی مختلف ملکوں کی صورت حال کے اعتبار سے فرق ہوسکتا ہے۔ بعض ملکوں میں مخصوص سماجی اور معاشی حالات اور انسانی حقوق کی جانب بہتر رویہ کی وجہ سے اقلیتوں سے نسبتاً بہتر سلوک کیا جاتا ہے، بعض دوسرے ملکوں میں مختلف متحارب گروہوں کے مابین رقابت اور

مختلف مفادات رکھنے والے طبقات کے درمیان ٹکراؤ کی باعث صورت حال زیادہ مشکل ہوسکتی ہے۔تحمل اور رواداری کی سطح اور گہرائی بھی مختلف سماجوں میں الگ الگ ہوتی ہے۔بعض مخلوط سماجوں میں مختلف ہونا کوئی نئی یا معیوب بات نہیں، ایسے سماج اقلیتوں کے ان خصائص کے ساتھ جو مروجہ رواجوں سے مختلف ہوں، تحمل اور رواداری سے پیش آتے ہیں، اس کے برعکس یک رخ اور یک رنگ سماجوں میں، جہاں اقلیتوں کی تعداد بہت ہی کم ہو، مختلف خصائص کو معیوب سمجھا جاتا ہے، ان سماجوں میں توقع کی جاتی ہے کہ سب لوگ ایک جیسے ہوجائیں اور اگر نہ ہو پائیں تو اقلیتوں پر اکثریت کا غضب نازل ہوتا ہے، ایسے ملکوں میں تحمل اور رواداری کم پائی جاتی ہے۔ سوویت یونین کے انہدام سے کچھ پہلے مشرقی یوروپ کے بعض مما لک میں مسلم اقلیتوں کو متعلقہ اکثریتوں کی جانب سے مختلف قسم کی جارحیتوں کا سامنا تھا، جس سے ان کے تہذیبی تشخص کو شدید خطرات لاحق ہوگئے تھے۔

گذشتہ صفحات میں یہ بھی واضح کیا جاچکا ہے کہ مسلم اقلیت کو کتنے ہی دشوار حالات کا سامنا کیوں نہ ہو، لیکن اسلامی طرز اخلاق اور اسلام کے اخلاقی قوانین کی پابندی ہر مسلم کے لئے لازمی ہے، تحریم ربا بھی ایسی ہی ایک پابندی ہے جس کا احترام غیر مسلم مما لک میں رہنے والے اقلیتی مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہے، تاہم ضروری مالیاتی اداروں کی غیر موجودگی میں یہ امر کچھ زیادہ ہی مشکل ہوجاتا ہے۔آیئے دیکھیں کہ غیر مسلم مما لک میں اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کے سلسلہ میں کیا دشواریاں حائل ہیں۔

اسلامی مالیاتی اداروں کی راہ میں دشواریاں

اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل دشواریوں کا سامنا کیا جاتا رہا ہے۔

۱-سیاسی حمایت کی کمی

عام طور پر اقلیتی گروہ کے پاس اس قدر سیاسی اقتدار نہیں ہوتا جتنا کہ اکثریتی گروہ کے پاس ہوتا ہے، یہاں تک کہ جمہوری ممالک میں بھی سماجی، سیاسی اور معاشی اداروں کی تشکیل اکثریتی گروہ کے ثقافتی مزاج کے مطابق کی جاتی ہے، اور اس سلسلے میں اقلیتی گروہوں کی ضروریات، ترجیحات، پسند اور ناپسند کا چنداں خیال نہیں کیا جاتا۔ اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اقلیتی گروہ بے گانگیت کا احساس کر کے علیحدگی پسندی کے خول میں بند ہو جاتا ہے۔ ہم عصر دنیا میں مختلف جگہوں پر اس قسم کے حالات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

۲-مہارت کی کمی

غیر مسلم ممالک میں اسلامی مالیاتی اداروں کے عدم وجود کا ایک بڑا سبب اسلامی مالیات سے متعلق مہارت اور علم رکھنے والوں کی کمیابی، بلکہ نایابی ہے، اسلامی مالیات کا علم رکھنے والے لوگ مسلم ممالک میں تو کسی حد تک مل بھی جاتے ہیں، لیکن غیر مسلم ممالک میں اسلامی علوم کی تعلیم کا مناسب اور کما حقہ انتظام نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنی فلاح اور ترقی کے لئے مالیاتی ادارے قائم بھی کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔

۳-ادارہ جاتی مالیات کی عدم موجودگی

اسلامی بینک کاری اور مالیات سے متعلق زیادہ تر سرگرمیاں پرائیوٹ سیکٹر میں ہوئی ہیں، خواہ ان کا تعلق مسلم ممالک سے ہو یا غیر مسلم ممالک سے۔ ایک بڑی بینکنگ کارپوریشن کے قیام کے لئے بڑے سرمایہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے، گو کہ عہد جدید میں اسلامی بینک کاری کا تجربہ ایک چھوٹے پیمانہ کے بینک سے شروع ہوا جو مصر کے ایک گاؤں مت غمر میں قائم کیا گیا تھا، اور اس کے قیام میں مقامی وسائل سے ہی کام لیا گیا تھا۔ وسائل کی کمی کے باعث مختلف غیر مسلم

ممالک میں مسلمان اپنا مالیاتی ادارہ قائم نہیں کر سکتے، حالانکہ ان حلقوں میں بھی تحریم ربا کے احترام کی خواہش کسی سے کم نہیں۔ غیر مسلم ممالک میں اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کی راہ میں ایک دوسری رکاوٹ بازار کا محدود سائز ہے، کیونکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمان نہ صرف اقلیت میں ہوں بلکہ دور دراز علاقوں میں منتشر بھی ہوں، یوروپ میں کئی اسلامی بینکوں کی ناکامی میں جزوی طور پر جغرافیائی عدم ارتکاز کا بھی دخل تھا۔

۴-نامناسب سیاسی ماحول

غیر مسلم ممالک میں اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام میں ایک رکاوٹ نامناسب سیاسی ماحول بھی ہے۔ اسلامی بینک اور دوسرے اسلامی مالیاتی اداروں کو تشفی بخش طور پر کام کرنے کے لئے ایک خاص ادارہ جاتی اور قانونی نظام درکار ہوتا ہے۔ کئی مسلم ممالک نے، جہاں کسی نہ کسی شکل میں اسلامی بینک کاری موجود ہے، یا تو اسلامی بینک کاری کے لئے نئے قوانین تشکیل دیئے ہیں، یا پھر قدیم قوانین میں ایسی ترمیمات کی ہیں کہ اسلامی بینک کاری کے لئے جگہ بنائی جاسکے۔ مسلم اقلیتی ممالک میں بیشتر حالتوں میں ان میں سے کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔ مزید برآں بیشتر ممالک میں پالیسی سازوں اور مرکزی بینک کاروں کے ذہنوں میں اب تک غیر سودی بینک کاری کی افادیت اور عملیت کے بارے میں شدید تحفظات اور شکوک موجود ہیں، اس لئے وہ غیر سودی مالیاتی اداروں کو مناسب تحفظ فراہم نہیں کرتے۔ فی الوقت بہت سے غیر مسلم ممالک میں کسی غیر سودی مالیاتی ادارہ کا قیام قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ ایسے ممالک میں مرکزی بینک کی طرف سے جمع قبول کرنے والے اداروں پر سخت شرائط عائد کی جاتی ہیں، جو اسلامی بینک کاری کے فروغ میں رکاوٹ ہوسکتی ہیں، مثلاً کئی ممالک میں مرابحہ سودی مالیات کے بدل کے طور پر نمودار ہوا ہے، لیکن بہت سے دوسرے ممالک میں بینکوں کو براہ راست تجارت سے دور رکھا جاتا ہے، ان ملکوں میں اسلامی مالیاتی ادارے مشکل سے ہی پنپ سکتے ہیں۔

مسلم اقلیتوں کی مالی ضروریات

اگر مسلم اقلیتیں ربا سے دور رہنا چاہتی ہیں تو ان کی مالی ضروریات رفع کرنے کے کچھ ایسے طریقے ہونے چاہئیں کہ ان ضرورتوں کو غیر ربوی بنیادوں پر رفع کیا جاسکے، بنیادی طور پر یہ ضروریات چار اہم میدانوں میں ہوسکتی ہیں۔

۱- ذاتی مالیات

سب سے پہلی ضرورت ذاتی مالیات (Personal Finance) کے میدان میں ہے، یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کسی فرد کی ذاتی آمدنی (Personal Income) اس کے اخراجات اور ضروریات سے کم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس فرد کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرض کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ذاتی مالیات کی دوسری ضروریات صارفین کے قرض کے میدان میں ہوتی ہیں، تاکہ صارفین دیرپا اشیائے صرف (Durable Consumer goods) کی خریداری کرسکیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ ضروریات بیشتر فنانس کمپنیوں کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں، جو دیرپا اشیاء کی خریداری کے لئے مال فراہم کرتی ہیں، بعض اوقات تجارتی کمپنیاں اور کریڈٹ کارڈ کمپنیاں بھی دیرپا اشیائے صرف کی خریداری کے لئے قرض فراہم کرتی ہیں۔ تجارتی کمپنیاں یہی کام فروخت بالاقساط یا Hire Purchase Schemes کے ذریعہ کرتی ہیں۔ اس کو صارفین کو دیا جانے والا قرض Consumer Credit بھی کہتے ہیں، قرض کی اس قسم میں سود کی شرح سب سے زیادہ پائی جاتی ہے جو 18 فیصد سے لیکر 30 فیصدی یا کئی بار اس سے بھی زائد پائی گئی ہے، چونکہ ان تمام طریقوں میں کسی نہ کسی شکل میں ربا پایا جاتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے غیر ربوی طریقے تلاش کئے جائیں۔

۲- چھوٹے پیمانے کی صنعت وتجارت

بہت سے غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتوں کے خاص پیشوں میں زراعت، چھوٹے پیمانہ کی صنعت وتجارت اور مختلف قسم کی دستکاریاں ہیں، ان پیشوں کو تجارتی بینکوں سے زیادہ قرض نہیں دیئے جاتے، جب ان کی مالی ضروریات معقول طریقوں سے بینکوں کے ذریعہ پوری نہیں کی جاتیں تو یہ کاروباری، سودی کاروبار کرنے والوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

۳- رہائشی مالیات (Housing Finance)

رہائش، انسانوں کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ آبادی، شہریت (Urbanization) اور صنعت (Industrialization) میں اضافہ کے ساتھ ساتھ رہائش کی طلب میں بھی اضافہ ہوتا ہے، لیکن اس کی رسد میں اسی تناسب سے اضافہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ رہائش کی قلت بڑھتی جارہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی قیمتوں میں بھی اس قدر اضافہ ہورہا ہے، کہ اب لوگ محض اپنی بچت کے ذریعہ رہائش کا انتظام نہیں کرسکتے۔ اس کے لئے مالیات (Finance) کی ضرورت ہے۔ تجارتی بنیادوں پر مالیاتی اداروں کے ذریعہ فراہم کی جانے والی مالیات، خواہ یہ مالیاتی ادارے نجی زمرۂ کار کے ہوں یا عوامی زمرۂ کار کے، اکثر وبیشتر سودی مالیات ہوتی ہے، بیشتر مسلم ممالک میں، متبادل انتظامات کی عدم موجودگی میں، مسلم صارفین سودی اداروں کی مدد لینے کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں، تاہم وہ اس سلسلہ میں اطمینان محسوس نہیں کرتے، اگر رہائشی مقاصد کے لئے غیر سودی بنیادوں پر مالیات فراہم کی جاسکے تو غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلم اقلیتوں کی خود اعتمادی اور حوصلہ میں قابل لحاظ اضافہ ممکن ہوسکے گا۔

۴- سرمایہ کاری کی ضروریات

ان لوگوں کے لئے جن کے پاس سرمایہ کاری کے لئے کچھ مالی وسائل موجود ہیں،

سرمایہ کاری کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، تاکہ وہ ان وسائل سے کچھ حلال آمدنی حاصل کرسکیں۔ بین الاقوامی سرمایہ کاروں کے لئے اب یہ مسئلہ اتنا شدید نہیں رہا، کیونکہ بین الاقوامی سطح پر اب متعدد ایسے اسلامی بینک، فنانس کمپنیاں، وغیرہ نمودار ہوگئے ہیں جو اسلامی طریقہ پر سرمایہ کاری کرتے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ اب تو بہت سے کثیر قومی بینک (Multinational Banks) بھی اسلامی سرمایہ کاری کرنے لگے ہیں، ان کے ذریعہ ان لوگوں کے مسائل حل ہوسکتے ہیں جو غیر سودی بنیادوں پر سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں، گذشتہ دو دہائیوں کے دوران سرمایہ کاری فنڈ (Investment Fund) میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے، لوگ اب بینکوں میں اپنا سرمایہ "جمع" (deposits) کی شکل میں رکھنے کے بجائے ان فنڈز کے ذریعہ سرمایہ کاری کرنا پسند کرتے ہیں، خواہ ان فنڈز کا انتظام وانصرام بینکوں کے ہاتھ میں ہو یا سرمایہ کار کمپنیوں کے ہاتھ میں۔ چونکہ ان میں سے بیشتر فنڈ ربوی بنیادوں پرکام کرتے ہیں، اس لئے ایسے فنڈز کی ضرورت ہے جو غیر سودی بنیادوں پر کام کریں، ظاہر ہے غیر مسلم ممالک میں بھی ایسے فنڈز کی شدید ضرورت ہے، چنانچہ شاید اسی ضرورت کے پیش نظر بیشتر اسلامی سرمایہ کاری فنڈز لندن میں شروع کئے گئے ہیں جو بین الاقوامی مالیاتی بازار کا ایک اہم مرکز ہے، اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان فنڈز کی کامیابی اور توسیع مین بڑا دخل ان مسلمان سرمایہ کاروں کی دلچسپی کا ہے جو مغرب میں مقیم ہیں، تاہم اب کئی مسلم ممالک میں بھی اسلامی سرمایہ کاری فنڈز کا آغاز کیا جاچکا ہے۔

غیر سودی متبادل

اگر غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلم اقلیات ربا سے بچنے کی اپنی خواہش میں مخلص ہیں، تو اپنے اپنے متعلقہ ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان کو ایک ایسی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی کہ وہ اپنے ہر مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لئے الگ حکمت وضع کریں، یقیناً ایک اسلامی مالیاتی ادارہ، جیسے اسلامی بینک، کا قیام ان مسائل کا یقینی حل ہے۔ اس ادارہ کی شاخیں ان

علاقوں میں کھولی جاسکتی ہیں جہاں مسلمانوں کا ارتکاز ہو۔ اس ضمن میں حکومت وقت اور مرکزی بینک سے اس اسلامی مالیاتی ادارہ کے دائرۂ کار اور اس پر کنٹرول کے طریق کار کے بارے میں گفت وشنید کی جاسکتی ہے۔

تاہم یہ ممکن ہے کہ بعض غیر مسلم ممالک میں یہ متبادل ممکن نہ ہو، مثلاً بعض غیر مسلم ممالک میں مسلمان اتنی قلیل تعداد میں ہوسکتے ہیں کہ کسی اسلامی مالیاتی ادارہ کا قیام ممکن نہ ہو، یا یہ کہ اکثریت اور حکومت وقت کا رویہ تعاون پر مبنی نہ ہو، ایسے حالات میں اقلیت کے سامنے اس کے سوا دوسرا چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ بعض دوسرے متبادل تلاش کرے۔

جذبۂ تعاون

مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے "وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (سورہ مائدہ:۲) یعنی نیکی اور تقویٰ (کے کاموں) میں ایک دوسرے کا ساتھ دو اور برائی وگناہ (کے کاموں) میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دو، مسلمانوں کے لئے، خواہ وہ کسی ملک میں اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، تمام اجتماعی کاموں میں یہ آیت ایک رہنما اصول کی طرح ہے۔ اس تعلیم کی بنیاد پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ مسلم اقلیتوں کو امداد باہمی تحریک سے استفادہ کرنا چاہیے اور اپنے اجتماعی کاموں کی شیرازہ بندی، اور باہمی اصول پر کرنا چاہیے۔[17]

ذیل میں مالیاتی زمرہ کار میں امداد باہمی کے اصولوں کے اطلاق کی نشاندہی کی جارہی ہے:

۱- جمہوری شراکت (Democratic Participation)

امداد باہمی انجمنیں جمہوری شراکت کے اصول پر کام کرتی ہیں جس میں ہر ممبر کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تجارتی کمپنیوں میں ہر حصے (Share) کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔ انجمن امداد باہمی میں افراد کے مابین مساوات قائم ہوتی ہے جس کو مالی وسائل کی ملکیت سے

علاحدہ کردیا گیا ہے۔ مسلم اقلیتی ممالک میں اجتماعی اور سماجی کاموں کی شیرازہ بندی کے لئے امداد باہمی کے اصول مناسب معلوم ہوتے ہیں، ان کے ذریعہ اجتماعی تنظیم بھی ممکن ہے اور کسی کو ان کے خلاف انگلی اٹھانے کا موقع بھی نہیں ہوگا، کیونکہ مختلف جمہوری ممالک میں امداد باہمی کے اصولوں کو مسلمہ طور پر قبول کیا جاچکا ہے۔

۲- عام ممبر شپ (Open Membership)

امداد باہمی کے اصولوں کے مطابق انجمن امداد باہمی کی ممبری عام ہوتی ہے اور کسی بھی فرد کو، جو انجمن امداد باہمی کے عام مقاصد اور طریقہ کار سے اتفاق رکھتا ہو، ممبر بنایا جاسکتا ہے۔ ممبر بناتے وقت رنگ، نسل، مذہب، فرقہ، طبقہ، یا سیاسی رجحانات کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ امداد باہمی اصولوں کی یہ شق مسلم اقلیتوں کے لئے خاص طور پر مناسب ہوسکتی ہے جو اپنے اجتماعی کاموں میں غیر مسلموں کو شریک کرسکتے ہیں اور اس طرح انھیں اسلام کی برکتوں میں شریک کرسکتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک اسلامی کوآپریٹیو کریڈٹ سوسائٹی قائم کی گئی تو سوسائٹی کے اصول وضوابط کے تحت، اس کے اغراض ومقاصد سے متفق لوگوں کو عام طور پر ممبر بنایا جاسکتا ہے اور اس طرح غیر سودی مالیات (Interest Free Finance) کے حق میں فضا ہموار کی جاسکتی ہے۔

۳- امداد باہمی کی تعلیم (Cooperative Education)

تمام کوآپریٹیو سوسائٹیز کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممبروں، افسروں، اور ملازموں کے لئے ایسی تعلیم کا انتظام کریں جس سے امداد باہمی تحریک کے طریقوں کے بارے میں ان کا علم بڑھ سکے۔ اسی طرح وہ عام پبلک کے لئے بھی امداد باہمی کے اغراض ومقاصد اور طریق کار کے بارے میں اور خاص اس انجمن کے اغراض ومقاصد کو فروغ دینے کے لئے بھی اقدامات کرسکتی ہیں، اگر مسلم اقلیتیں اسلامی مالیات کو فروغ دینے کے لئے امداد باہمی کے طرز پر

انجمن قائم کریں تو اس اصول کا استعمال بھی اسلامی مالیات اور اس کے اصولوں کے فروغ کے لئے کیا جاسکتا ہے۔

۴-امداد باہمی کا فروغ (Promotion of Cooperation)

امداد باہمی کا ایک اور اصول یہ ہے کہ انجمن امداد باہمی اپنے ممبروں کے مفاد کے لئے سرگرم عمل ہو، اور امداد باہمی کے اغراض ومقاصد کے لئے دوسری انجمنوں سے مقامی، علاقائی، قومی، اور بین الاقوامی سطحوں پر تعاون کرے، اسلامی مالیاتی اداروں کے لئے جو امداد باہمی کی بنیاد پر کام کرتے ہوں یہ تعاون دوہرا ہوسکتا ہے، ایک طرف تو دوسرے اسلامی مالیاتی اداروں سے تجارتی بنیادوں پر تفاعل اور تعامل کر سکتے ہیں، دوسری جانب یہ تعاون امداد باہمی کی بنیاد پر بھی ہوسکتا ہے۔(18)

اسلامی مالیات کے لئے امداد باہمی کے اصولوں کے اطلاق سے چند بین فائدے حاصل ہوں گے جن کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

۱- اگر اسلامی مالیاتی اداروں کو امداد باہمی کی بنیادوں پر منظم کیا جائے تو یہ ادارے کارپوریٹ سیکٹر میں کام کرنے والے مالیاتی اداروں کی نامناسب اور نابرابر مسابقت سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ تو بدیہی ہے کہ کارپوریٹ سیکٹر کے اداروں کے پاس زیادہ سرمایہ ہوتا ہے، وہ بازار کی وسعت اور اعلیٰ ٹکنالوجی کی برکتوں سے بھی متمتع ہوتے ہیں، دوسری جانب اسلامی مالیاتی ادارے، اگر ان کو مسلم یا غیر مسلم ممالک میں موجودہ قوانین کے تحت قائم کیا جاسکے، اپنے نئے پن کی وجہ سے سرمایہ اور تکنیک کی کمی سے دوچار ہوں گے۔ چنانچہ نوتشکیل شدہ اسلامی مالیاتی اداروں اور روایتی مالیاتی اداروں کے مابین مسابقت غیر مساوی ہوگی۔ اگر اسلامی مالیاتی اداروں کو امداد باہمی کی بنیاد پر

منظم کیا جائے تو وہ اس عدم مساوات اور نامناسب مسابقت سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

۲- زیادہ تر ممالک میں زمرۂ امداد باہمی Cooperative Sector پر کارپوریٹ زمرہ کے مقابلہ میں کم پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ غیر مسلم ممالک کی مسلم اقلیتوں کے لئے امداد باہمی زمرہ میں اسلامی مالیاتی ادارے قائم کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہو، عام طور پر امداد باہمی ادارے قائم کرنے کے لئے قلیل سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ کارپوریٹ سیکٹر میں ایک تجارتی کمپنی قائم کرنے کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس کا تعین اس ملک کے تجارتی قانون (Company Law) میں کیا جاتا ہے۔ اپنی اس خاصیت کی وجہ سے امداد باہمی نظام میں ایسی لچک پائی جاتی ہے جو دوسرے نظاموں میں نہیں ہے۔

۳- امداد باہمی نظام میں چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں، عام طور پر امداد باہمی میں پیمانے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی اور ایک امداد باہمی ادارہ بہت تھوڑے سرمایہ سے شروع کیا جاسکتا ہے۔

۴- امداد باہمی نظام میں مختلف مقاصد کے لئے مختلف طرح کے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں، جیسے صارفین کی انجمن (Consumers Cooperative)، پیدا کنندگان کی انجمن امداد باہمی، (Producers Coop) تقسیم کنندگان کی انجمن امداد باہمی (Distributors Cooperative)، انجمن امداد باہمی برائے قرض (Cooperative Credit Society) وغیرہ، تاہم ان کی کامیابی کا ریکارڈ مختلف زمروں میں مختلف رہا ہے۔

۵- امداد باہمی اداروں کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ ان میں خاصی لامرکزیت (Decentralization) لائی جاسکتی ہے اور ان کے ذریعہ ایسی آبادیوں کو نفع پہنچایا جاسکتا ہے جن کا سائز خاصا مختصر ہو۔

گو کہ اسلامی مالیات، تحریک امداد باہمی کے تمام امکانات سے ابھی پوری طرح بہرہ مند نہیں ہوئی، تاہم بعض مسلم اقلیتی مما لک میں اس جانب کچھ قدم اٹھائے گئے ہیں۔ مثلاً ری پبلک آف ٹری نیڈاڈ میں 1983 میں ایک مسلم کریڈٹ یونین کوآپریٹیو سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جو اس وقت سے سرگرم عمل ہے۔[19] اسی طرح ہندوستان، انڈونیشیا اور ملیشیا میں بڑے پیمانہ پر غیر سودی انجمنیں کام کر رہی ہیں جو قرض فراہم کرتی ہیں، گو کہ ان میں سے بیشتر امداد باہمی کے اصولوں پر قائم نہیں کی گئیں۔[20]

غیر سودی، امداد باہمی قرض انجمنیں (Interest Free Coop. Credit Societies)

ذاتی مالیاتی ضروریات پوری کرنے کے لئے غیر سودی قرض انجمنیں، امداد باہمی کے اصولوں پر قائم کی جاسکتی ہیں، تا کہ ممبران کو ضرورت پڑنے پر غیر سودی قرض فراہم کیا جا سکے۔ غیر سودی ذاتی قرضوں کی ضرورت دیہی اور شہری دونوں علاقوں میں پڑسکتی ہے۔ غیر سودی قرض فراہم کرنے والی کسی سہولت کی عدم موجودگی میں لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ اپنی ضروریات رفع کرنے کے لئے روایتی یا غیر روایتی سودی ذرائع میں جا پھنسیں۔ اگر امداد باہمی کی بنیاد پر قرض فراہم کرنے والی انجمنیں موجود ہوں تو یہ ضرورتیں آسانی سے پوری کی جاسکتی ہیں اور سود خوروں کے چنگل سے بھی بچا جاسکتا ہے۔

ضروری نہیں کہ غیر سودی امداد باہمی انجمنوں کا دائرہ کار صرف قرض فراہم کرنے تک محدود رہے، مناسب تبدیلیوں کے ساتھ ان انجمنوں کو ممبران کی قصیر مدتی اور طویل مدتی مالیاتی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان انجمنوں کے ذریعہ دیرپا اشیائے صرف (Durable Consumer Goods) اور نیم دیرپا اشیائے صرف (Semi-durable Consumer Goods) مثلاً فرنیچر اور برقیاتی سامان کی خریداری کے لئے مال فراہم کیا جاسکتا ہے۔

فی الحقیقت غیر سودی کریڈٹ سوسائٹی، اور غیر سودی بچت وسرمایہ کاری انجمن (Interest Free Saving and Loan Associations) ان ملکوں میں، اس وقت بھی سرگرم عمل ہے جہاں اسلامی بینک کاری کی سہولتیں موجود نہیں ہیں، مثلاً فلپائن اور تھائی لینڈ میں ایسی انجمنوں کے وجود کی خبر موجود ہے جو عموماً غیر منظم زمرہ میں کام کررہی ہیں (21)۔ عام طور پر یہ انجمنیں اس طرح کام کرتی ہیں کہ ہر ماہ ہر ممبر ایک متعین رقم جمع کراتا ہے، اپنی باری آنے پر اس کو ایک غیر سودی قرض مل جاتا ہے، اگر اس کی ضرورت شدید ہو تو باری آنے سے قبل وہ کسی ایسے ممبر سے باری تبدیل کرسکتا ہے، جس کی باری ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں ادارے ہندوستان کے طول وعرض میں بھی کام کررہے ہیں۔ اس طرز کے غیر سودی ادارے صرف ان ملکوں میں ہی نہیں ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں پائے جاتے ہیں، بلکہ انڈونیشیا جیسے ملک میں بھی اس قسم کی انجمنیں موجود ہیں، جو نہ صرف ایک مسلم اکثریتی ملک ہے بلکہ وہاں بنک معاملات جیسا کامیاب اسلامی بینک بھی موجود ہے۔

غیر سودی امداد باہمی انجمنوں کی سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ نہ تو یہ اسلامی بینک کی طرح کام کرسکتی ہیں اور نہ ہی اسلامی بینکوں کا متبادل بن سکتی ہیں، یہ انجمنیں اسلامی مالیاتی طریقوں (Islamic Financing Techniques) کے پورے امکانات سے بھی مستفید نہیں ہوسکتیں، کیونکہ یہ بنفسہ بینک نہیں ہیں۔ تجارتی بینکوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ بہت سے افعال انجام دیئے جاسکتے ہیں، جب کہ کوآپریٹیو سوسائٹی کے سامنے بیشتر صرف ایک مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا ہے۔

ہاؤسنگ سوسائٹی

رہائشی مقاصد کے لئے مالیات کی ضرورت، تمام معاشروں اور تمام زمانوں میں انسانوں کی بنیادی ضرورت رہی ہے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں مکانوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی قیمتوں

کے باعث اس نوع کی مالیات کی اہمیت میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے۔ مغربی ممالک میں مکانوں کی تعمیر اور خرید وفروخت کے لئے اختصاصی مالیاتی ادارے وجود میں آگئے ہیں، جو مکانوں کی تعمیر اور خریداری کے لئے مالیات فراہم کرتے ہیں، جیسے تجارتی بینک، رہن کمپنیاں (Mortgage Companies)، بچت اور سرمایہ کاری انجمنیں (Saving Loan Associations) جنھیں امریکا میں S & L کہا جاتا ہے، اور اختصاصی مالیاتی ادارے جیسے ہاؤسنگ بینک وغیرہ، طبعی طور پر یہ سب ادارے سودی بنیادوں پر کام کرتے ہیں، چنانچہ ان ممالک میں مقیم مسلمانوں کے لئے یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ یا تو وہ سودی بنیادوں پر ان اداروں سے معاملہ کریں یا اپنے ذاتی مکان سے محروم رہیں۔

تاہم اگر ان ممالک کے مسلمان امداد باہمی کی بنیاد پر ہاؤسنگ سوسائٹی کا تجربہ کریں تو اس مسئلہ کے غیر سودی حل کی جانب پیش رفت ہوسکتی ہے۔

سرمایہ کاری کا مسئلہ

مسلم اقلیتوں کے لئے سرمایہ کاری کا معاملہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے جس کا اسلامی حل ڈھونڈا جانا ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مسلم افراد اپنی بچت کی سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں اور اس سرمایہ کاری سے مثبت اور حلال آمدنی کی توقع رکھتے ہیں تو یہ ایک بجا اور فطری خواہش ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام سرمایہ سے آمدنی کو ناجائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام میں سرمایہ سے ایک خاص قسم کی آمدنی (یعنی سود) حرام قرار دی گئی ہے۔ اسلامی بینکوں کی عدم موجودگی میں مسلم اقلیت کے افراد اپنی بچت کی سرمایہ کاری کس طرح کریں کہ ان کو حلال آمدنی حاصل ہوسکے؟

اس سوال کا جزوی جواب تو اسلامی سرمایہ کاری فنڈز (Islamic Investment Funds) کے ذریعہ مل سکتا ہے۔ گذشتہ دو تین دہائیوں میں ساری دنیا میں سرمایہ کاری فنڈز کو

خاص طور پر عروج حاصل ہوا ہے۔ لوگ اب اپنا پیسہ بینک کے جمع کھاتوں (Bank Deposits) میں رکھنے کے بجائے ان فنڈز میں لگاتے ہیں۔ بہت سے بینک، مالیاتی کمپنیاں (Finance Companies)، سرمایہ کاری کمپنیاں (Investment Companies) اور دوسرے مالیاتی ادارے اس طرح کے فنڈز چلاتے ہیں، چونکہ اس طرح کے بیشتر فنڈز نہ صرف سودی بنیادوں پر کام کرتے ہیں، بلکہ اکثر زیادہ آمدنی کی لالچ میں ایسے اعمال میں بھی اپنا سرمایہ لگانے سے نہیں ہچکچاتے جن کو اسلامی اخلاقی معیاروں سے قابل قبول نہیں سمجھا جاتا، مثلاً شراب، قمار بازی، یا فحشیات سے متعلق صنعتوں میں سرمایہ کاری۔

اس صورت حال میں اسلامی سرمایہ کاری کی ضرورت بدیہی ہے اور اسی ضرورت کے احساس کی بنا پر اسلامی سرمایہ کاری فنڈز کا وجود عمل میں آیا ہے۔ زیادہ تر ایسے فنڈز لندن میں قائم کئے گئے ہیں جو اب بھی بین الاقوامی مالیاتی بازار کا ایک اہم مرکز ہے[22]۔

حــواشـــی

علم معاشیات: تعریف، مقصد اور منہاج

1) غالباً یہ تذکرہ یہاں پر دلچسپی سے خالی نہ ہوکہ 1776 میں تین خاص واقعات تین مختلف دائروں میں ظہور پذیر ہوئے اور غالباً دنیا کی شکل تبدیل کرنے میں اور موجودہ صنعتی تہذیب کو جنم دینے میں جتنا ان تین واقعات نے حصہ لیا ہے اتنا کسی اور چیز نے نہیں۔ 1776 میں جیمس واٹ نے بھاپ کا انجن ایجاد کیا۔ 1776 میں ہی ریاستہائے متحدہ امریکا میں اعلان آزادی پر دستخط کئے گئے اور اسی سال ایڈم اسمتھ کی کتاب ''دولت اقوام'' شائع ہوئی۔ پہلے واقعہ نے ٹکنالوجی میں ان تبدیلیوں کا آغاز کیا جن کا نقطۂ عروج موجودہ دور کی خودکار مشینوں کا نظام ہے۔ دوسرا واقعہ سیاسیات کی حدود میں تھا۔ اور امریکا کے صفحۂ ہستی پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے نمودار ہونے سے بین الاقوامی سیاست، اور بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ تیسرے واقعہ نے بہ حیثیت علم معاشیات کی بنیاد ڈالی جس نے 2 سو سال کے اندر اتنی ترقی کرلی کہ اسے ''سماجی علوم کی ملکہ'' کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ٹکنالوجی، سیاسیات اور معاشیات، میں ہونے والے ان بظاہر غیر متعلق تین واقعوں نے جن تبدیلیوں کا آغاز کیا وہ ایک دوسرے سے متعلق اور مربوط تھیں اور ان سب عوامل نے مل جل کر موجودہ صنعتی تہذیب کی تشکیل کی۔

2) جے، بی، سے، (J.B. Say) نے کہا کہ (معاشیات دولت کا علم ہے)۔

3) کارلائل نے اسے Bread & Butter Science اور Dismal Science کے خطابات سے نوازا ہے۔

4) الفریڈ مارشل ''اصول معاشیات''

5) ایضاً

6) ایضاً

7) آپ غالباً جانتے ہونگے کہ جب کسی عام لفظ کو کسی علم میں کسی خاص معنی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اسے اصطلاح کہتے ہیں اور ایسے معنی کو اصطلاحی معنی کہتے ہیں۔

8) See Gery S Becker: Economic Theory Alfred A Knopf. Ine New York. 1971, p.viii.

9) Theory: The analysis of a set of facts in their relation to one another, The general or abstract principles of a body of fact, a science or an

art. 3. A plusible or scientifically accepteble general principle or body of principle offered to explain a phenemenon 4, A hypothesis assured for the sake of argument or investigation. 5. Abstract thought".

C.F. Webster's New Collegiate Dictionary G & C Mirram Co, springfield, Massachusset.

10) فی الحقیقت تجرید اور عمومیت ایک دوسرے سے گھتے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک مجرد تصور سے ہماری مراد ایسے تصور سے ہے جو مخصوص صفات سے عاری ہو۔

11) Fritz Machlup "The Problem of Verification in Economics. Southern Economic Journal Vol. xxii, (1955) pp. 1-21.

حواشی: معاشی نظام: اقسام، وظائف اور ماہیت

1. George N. Halm: Economic Cystems: A Comparative Anolysis (Oxford of IBH) P. 13.

حواشی: ہندوستان میں اسلامی مالیات...

1. Ausaf Ahmad, **Indian Muslim: Issues in Social and Economic Development,** New Delhi: Khama Publishers, 1993, p. 11.
2. Omar Khalid, **Indian Muslims Since Independence,** New Delhi: Vikas Publishing House, 1995, p. 66.
3. مثال کے لئے دیکھئے اوصاف احمد اور عمر خالدی کی کتابیں، رفیق زکریا نے بھی اپنی کتاب کا ایک معتد بہ حصہ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی صورت حال کی تفتیش میں صرف کیا ہے۔
4. یہ صرف قیاس نہیں ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ "اس عام احساس کے پیش نظر کہ ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی

مالیاتی پالیسیوں کے فوائد، اقلیتوں، مندرجہ فہرست ذاتوں، مندرجہ فہرست قبائل اور دوسرے کمزور طبقوں تک نہیں پہنچ سکے'' حکومت ہند نے ایک اعلیٰ اختیاراتی پینل کی تشکیل کی تا کہ وہ اس مسئلہ کی تفتیش کر سکے۔ اس اعلیٰ اختیاراتی پینل کو اس کے چیئر مین ڈاکٹر گوپال سنگھ کے نام پر گوپال سنگھ پینل کہا جاتا ہے۔ پینل نے گو کہ اپنی رپورٹ 1983ء میں حکومت کو سونپ دی تھی لیکن اس کو 1991ء میں ہی جاری کیا جاسکا، رپورٹ نے اس بات کی تصدیق کی کہ اقلیتوں کو ملک کی ترقیاتی کوششوں میں سے ان کا جائز حق نہیں مل پاتا۔

5. **Annual Report,** National Commission on Minorities, 1992, p. 321.

6. Ibid, p. 249.

7. **"India's Best Banks"** Business India Dated January, 11-24, 1999, p. 76.

8. Rahmatullah "Islamic Banks in India" **Journal Institute of Muslim Minority Affairs,** Vol. 13, No.2, July 1992, p. 317-24

9. Rahmatullah, Ibid, p. 318.

10. Ausaf Ahmad, Comment on Islamic Banks in India, **Journal of Institute of Muslim Minority Affairs,** Vol. 14, No.1, p. 256.

11. ایک طویل عرصہ تک ہندوستان میں غیر سودی اداروں کے بارے میں شماریاتی حقائق فراہم کرنے کا واحد ذریعہ یہ مضمون تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ آل انڈیا کونسل آف مسلم اکنامک اپ لفٹ منٹ (AICMEU) نے ہندوستان کے غیر سودی اداروں کے بارے میں ایک دوسرا سروے کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے نتائج تا حال مہیا نہیں ہیں۔ پہلے سروے کے نتائج بھی کچھ زیادہ ہمت افزا نہیں تھے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ڈاک کے ذریعہ کئے جانے والے سروے کے نتائج یوں بھی متاثر کن نہیں ہوتے۔

12. الامین فنانشل اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن کا منظور شدہ سرمایہ 10 کروڑ تک بڑھا دیا گیا ہے۔ اس سے قبل اس کا منظور شدہ سرمایہ صرف 5 کروڑ روپیہ تھا۔ جس کو 10 روپئے والے 50 لاکھ حصص میں تقسیم کیا گیا تھا۔ منظور شدہ سرمایہ میں اضافہ کمپنی کی کامیابی کی ایک دلیل ہے۔

13. یہ معلومات کمپنی کے شائع کردہ ایک کتابچہ سے حاصل کی گئی ہیں۔

14. اسلامی انوسٹمنٹ فنڈ کے بارے میں معلومات درج ذیل مضمون سے حاصل ہوسکتی ہیں۔

Osman Babikir, "Islamic Investment Funds: The Made of Resource Mobilization" Jeddah Islamic Research and Training Institute, 1998.

15. ان معیاروں کا خیال نہ رکھنے کے باعث کئی تجارتی کمپنیاں جو بڑے بڑے دعوے کرتی تھیں ناکامی کا شکار ہو چکی ہیں، مثلاً تامل ناڈو کی المیز ان کمپنی، حیدرآباد میں بھی ایک مالیاتی کمپنی بحران کا شکار ہونے کے بعد بند ہو چکی ہے، اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر فریب دہی کے الزام میں گرفتار بھی کر لیا گیا تھا۔ دیکھیے سعودی گزٹ، مورخہ 28 فروری 1999۔

16. ہندوستان میں کوآپریٹیو بینک خاصی بڑی تعداد میں ہیں۔ اب ہندوستانی مسلمان بھی اس میدان میں داخل ہو رہے ہیں اور انھوں نے کئی کوآپریٹیو بینک قائم کئے ہیں، مثلاً بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک (ممبئی) امانت کوآپریٹیو بینک (بنگلور) اور جامعہ کوآپریٹیو بینک (نئی دہلی)۔ مؤخر الذکر جدید ترین ہے، یہ سب ادارے سودی بنیادوں پر کام کرتے ہیں، ان میں سے امانت بینک بعض وجوہ کی بناء پر بند کیا جا چکا ہے۔

حواشی: اسلامی مالیات اور مسلم اقلیتی ممالک

1. Munawwar Iqbal, Ausaf Ahmad and Taqiullah Khan, "Challenges Facing Islamic Banking", Jeddah Islamic Research and Training Institue, 1998, P.1.
2. یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارے بین الاقوامی مالیاتی بازار کا کتنا بڑا حصہ کنٹرول کرتے ہیں۔ اس کا صرف تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور تخمینے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں اور معقولیت کی حد میں رہ کر ان پر یقین کرنا مشکل بھی ہو سکتا ہے، تاہم بین الاقوامی مالیاتی بازار کے پنڈتوں کا اندازہ ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارے اس وقت 80 بلین ڈالر کا کاروبار کر رہے ہیں اور عنقریب یہ رقم 100 بلین ڈالر تک پہنچ جائے گی۔
3. M. Umar Chapra, "The Role of Islamic Banks in Non-Muslim countries" *Journal of the Institute of Muslim Minority Affairs,* JIMMA, Vol. XIII, No. 2, July 1992, P. 308-316.
4. Husaini U. Malami, "Prospects of Islamic Banking in Muslim Minority Countries" *Journal Institute of Muslim Minority Affairs,* JIMMA, Vol. VIII, No. 2, July 1992, PP. 308-316.
5. Rahmatullah, "Islamic Banking in India" *Journal Institute of Muslim Minority Affairs,* JIMMA Vol. XIII, NO.2, July 1992, PP. 317-324.
6. Ausaf Ahmad, "Islamic Banking in India: A Comment" *Journal Institute of Muslim Minority Affairs,* JIMMA, Vol. XIV, No.1-2, 1993, P.256.
7. Saleh Abdullah Kamel, "Islamic Banking in Practice: The Al-Barkah Group in

Muslim Minority Countries" *Journal Institute of Muslim Minority Countries, JIMMA*, Vol. XIII, No.2, July 1992, PP. 325-36.

8. فقہی نقطۂ نظر سے فقہاء نے ساری دنیا کو دو علاقوں میں تقسیم کیا تھا، دارالحرب اور دارالاسلام، موٹے طور پر ان کو مسلم اور غیر مسلم علاقوں سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مسلم علاقوں کی تمیزی خصوصیت (Distinguishing Feature) اسلامی قوانین کا اطلاق اور اسلامی طرز زندگی کا رائج ہونا ہے۔ ایک مشہور فقیہ کاسانی کے مطابق ایک مسلم علاقہ (دارالاسلام) اس وقت غیر مسلم علاقہ (دارالحرب) میں تبدیل ہوجاتا ہے، جب وہاں غیر اسلامی قوانین کا ظہور ہو۔ کاسانی مزید کہتے ہیں کہ دارالاسلام، دارالحرب میں تبدیل نہیں ہوسکتا، سوائے تین حالتوں کے۔ (1) غیر اسلامی قوانین کا اطلاق (2) دارالحرب سے الحاق (3) مسلم اور ذمی اصل امان سے محروم ہوجائیں، جو مسلمانوں کو اسلام کے سبب اور ذمیوں کو عقد الذمہ کے سبب حاصل تھی۔ (دیکھئے کاسانی: بدائع الصنائع، جلد 7، صفحہ 13)

9. M. N. Siddiqi, "Sources of Islamic Jurisprudence" in Hasmet Basar (ed.) *Development of Awqaf Properties,* Jeddah Islamic Reserch and Training Institute, 1984.

10. المحرر۔ بحوالہ نزیہ حماد: "احکام التمویل بالربا بین المسلمین وغیر المسلمین فی ظل العلاقات الدولیة المعاصرة (معاصر بین الاقوامی تعلقات کی روشنی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربوی معاملات کے احکامات) جدہ: دارالوفا للنشر والتوزیع۔

11. Justice Tanzeelur Rahman: "The Judgement That Could Not Be Delivered, p. 64.

12. اس دعویٰ کا تجزیہ بعد میں کیا گیا ہے۔

13. مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہ مقالہ اصلاً اردو زبان میں دسمبر 1936 میں ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ یوں تو اس مقالے کو اب نایاب ہوجانا چاہیے تھا، خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا، کیونکہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی کتاب میں یہ پورا مقالہ اپنے جوابی مقالہ کے ساتھ شائع کردیا۔ دیکھئے ابوالاعلیٰ مودودی، (سود) اردو، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، 1993، اس کتاب کے عربی اور انگریزی ترجمے بھی اب دستیاب ہیں۔ چنانچہ مولانا گیلانی کا اصل مقالہ بھی ان زبانوں میں بھی دستیاب ہے۔

14. النووی: المجموع بحوالہ نزیہ حماد، حوالہ سابق، ص 10

15. ابوالاعلیٰ مودودی: سود

16. اب سے کچھ سال قبل بینک آف انگلینڈ کے گورنر نے اپنی ایک تقریر میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ برطانوی بینک کاری قوانین اور اسلامی بینک کاری باہمی طور پر متناقض ہیں۔

17. امداد باہمی تحریک کا تجربہ برطانیہ، جرمنی، فرانس، بلجیم، آسٹریلیا، اٹلی، ڈنمارک، فن لینڈ، ناروے اور سویڈن وغیرہ میں مختلف میدانوں میں کامیابی سے کیا جاچکا ہے۔ خاص طور پر سویڈن میں پیداوار اور

تقسیم کے میدان میں امداد باہمی انجمنیں اتنی کامیاب ہوئیں کہ ان کو سویڈن کی معیشت میں ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ بین الاقوامی اتحاد برائے امداد باہمی (International Cooperative Alliance) کے مطابق ساری دنیا کے 355 ملین لوگ امداد باہمی تحریک سے وابستہ ہیں۔

18. اسلامی طرز کی امداد باہمی انجمنوں کے بین الاقوامی وفاق کی تجویز کے لئے دیکھئے Imtiaz Ali, "Islamic Cooperatives: Pathway in Islamic Finance" Conference Islamic Banking & Finance Organized by ISNA, July 17-18, 1998.

20. ان انجمنوں کا تذکرہ آگے آئے گا۔

21. Mohammed Arif, *Islamic Banking in Southeast Asia* Singapore: Institute of Southeast Asian Studies, 1988.
22. Rodoney Wilson, *"Challenges and Opportunities for Islamic Banking and Finance in the West! The U.K. Experience"* Jeddah: Islamic Research and Training Institute, 1998. (Unpublished).

{}.....{}.....{}